

رجسٹرڈ نمبر ۴۶۶

۶۱۹۵۱
(جنوری - فروری ۱۹۵۱ء)

کراچی

قیمت فی کاپی ۵۰

تصانیف نیاز فوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
اجیل انسانیت

”من ویر دال“

مولانا نیاز فچوری کی ۴۴ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک
غیر فانی کارنامہ جس میں سلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع
انسانی کو انسانیت گہری و اخوت عامہ کے ایک شتہ سے وابستہ
ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد
و رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی
اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور
خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۲، ۴ صفحات۔ جلد سات روپیہ آٹھ آنے (معہ)
علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من ویر دال کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسائل پر حضرت یاز نے روشنی ڈالی ہے انکی
مختصر فہرست یہ ہے۔ ۱۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت
انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان
خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور
ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم
و عار توہر۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ابرو
سومن کوثر۔ امام مہدی۔ نو محمدی اور پل صراط۔ آتش فرو
ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ کاغذ سفید و بیر۔
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

جمالستان

حسن کی عیاریاں

ترغیبات حبسی

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالا اور افسانوں کا
مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ
قبل حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے
کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں نقل
کئے گئے ہیں ڈیشن میں متعدد افسانے
و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے
جو پہلے ادیشنوں میں نہ تھے۔
اس نے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول

اور دوسرے افسانے
حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ
جس میں تاریخ اور تشارطیف کا بہترین
استراج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں
کے مطالعے سے آپ کو واضح ہو گا کہ تاریخ کے
حوالے اور ان میں کتنی دلکش حقیقتیں
پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے
انگریز و افغانوں کو
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

شہوانیات جلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری
و غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسی
اہمیت نہایت شرح و بسط کے ساتھ متفقانہ
تبصر کیا گیا کہ فحاشی دنیا میں کون کس
سرخ روگ ہوئی نیز کہ مذاہب عالم نے اسے
واجب و کتبہ کیسے رد کیا اس کتاب میں
انگریز و افغانوں کے

سالنامہ "نگار" ۱۹۵۱ء

مستقبل کی تلاش میں

انتساب

دُنیا کے تمام کاشتکاروں، مزدوروں اور

جماعتِ اسلامی کے ہر ہر فرد کے نام

شیرشو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ

مردشو، مردانہ پندِ ناصحاں را گوش گیر

نیاز

۱۹۱۵ء
۱۸۶۲
۱۸۶۲

ایک مستقبل کی تلاش میں (مارس ہنڈس)

مترجم = لطیف الدین احمد اکبر آبادی

جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب - صف ۱۱۱

نیاز فحشوری

اظہار تشکر

میں جناب لطیف اکبر آبادی کا صدمہ ممنون ہوں کہ انھوں نے مارس ہنڈس کی کتاب کے ترجمہ و تلخیص کا بار اپنے سر لیکر سالنامہ کی طیاری میں میری بڑی مدد فرمائی
نیاز

ایک مستقبل کی تلاش میں

حال ہی میں ایک یورپین سیاح مارس ہندس (Maurus Hindus) کی کتاب شائع ہوئی ہے، جس کا نام ہے ”In search of a future“۔ یہ کتاب نتیجہ ہے ایران، مصر، عراق اور فلسطین کی سیاحت کا جو اس نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ وہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے ان ملکوں کے مستقبل کے متعلق خود کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس نے سیاحت کے لئے اس سرزمین کو اس لئے پسند کیا کہ مشرق وسطیٰ کے مسائل سے روس و امریکہ کو جو گہرا تعلق حاصل ہے، اس کے اسباب و نتائج کو اچھی طرح سمجھ سکے کے لئے خود وہاں جانا ضروری تھا۔ اس نے ایران میں کافی وقت صرف کیا کیونکہ یہی وہ ملک ہے جو روس و امریکہ کے درمیان عرصہ سے ”استخوان جنگ“ بنا ہوا ہے اور جس کا وزن یہاں کی سیاسی ترازو کے پلے کو جس طرف چاہے جھکا سکتا ہے، اس نے گاؤں گاؤں جا کر یہاں کی اقتصادی و معاشی حالات کا مطالعہ کیا، اس نے ہر طبقہ کے لوگوں سے ملکر ان کے رجحانات کا پتہ چلایا اور وہ یہاں کی آبادی کے افلاس، ملک کی تباہ حالی اور حکومت کی بد نظمی سے اس قدر متاثر ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ یہاں کی سیاسیات کا مطالعہ کرتا، یہاں کے اقتصادی حالات پر آنسو پانے لگا اور سوچنے لگا کہ اس خوبصورت، زرخیز، شاداب و شگفتہ سرزمین کو اس کے ہولناک مستقبل سے کیونکر بچایا جاسکتا ہے۔

انہیں تاثرات کو لئے ہوئے وہ ایران سے مصر گیا، اور مصر سے عراق و فلسطین پہنچا، لیکن بجائے اسکے کہ ان تاثرات میں کمی ہوتی، ان میں اور اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ اس نے ان ملکوں کی حالت بھی ایسی ہی خراب پائی اور وہ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر مشرق وسطیٰ کی مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کو دنیا میں باقی رہنا ہے تو انہیں فلسطین کی اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے جس نے صحرا اور ریگستان کو چند دنوں میں خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ اگر فلسطین میں یہودی نہ ہوتے تو

مشرق وسطیٰ کی نجات کے لئے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ ان کو دیکھ کر مشرق وسطیٰ کے مسلمان سمجھ سکیں کہ محنت و کوشش اور صحیح و صالح تدابیر سے انسان کیا نہیں کر سکتا۔

اس نے ایران، مصر اور عرب ہر جگہ عام آبادی اور خصوصیت کے ساتھ کاشتکاروں اور مزدوروں کے حالات کا مطالعہ کر کے افسوس کیا ہے کہ مصر میں جسے کرۂ زمین کا چمنستان کہنا چاہئے۔ تین چوتھائی دیہی آبادی پاؤں کی ایک خاص بیماری (Bilharzia) میں صرف اس لئے مبتلا نظر آتی ہے کہ وہ جوتا نہیں خرید سکتے۔ شام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ”یہاں کی دو تہائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور چھ حصہ زمین کا ان زمینداروں کے قبضہ میں ہے جنہوں نے جا کر کبھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ کاشتکاروں کی حالت کس قدر خراب ہے۔“

عراق میں جہاں قابل کاشت زمین کی کمی نہیں، صرف چھ حصہ کاشت کیا جاتا ہے اور وہ بھی نہایت تکلیف و مصیبت کے ساتھ۔ وہ کہتا ہے کہ ”مشرق وسطیٰ کے کاشتکار طبقہ کا تصور گویا ”فاقد و موت“ کا تصور کرنا ہے اور یہاں کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، صاف پانی حاصل کرنے کے لئے بھی ان کے پاس پیسہ نہیں ہے، یہاں کے لوگ جانوروں کو بھی اپنے ہی جھونپڑوں میں رکھتے ہیں اور گندگی نے ان کی صحتوں کو بالکل تباہ کر رکھا ہے۔“

سیاح مذکور جب ان ملکوں کی سیاحت کر کے اسرائیلی حکومت میں پہنچتا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور اس کو یقین نہیں آتا کہ کیا یہ بھی اسی سرزمین کا حصہ ہے، جسے وہ اس قدر بد حال دیکھ چکا ہے۔ چھ مہینے کی سیاحت کے بعد سب سے پہلے اُسے یہیں جرات ہوئی کہ وہ ایک سلیقہ کی دوکان سے ناسپاتی لیکر کھا سکتا اور صاف پانی سے نہا سکتا۔

ہندس، یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اسرائیلی حکومت کیونکر چند دنوں میں صحرا اور گیستان کو باغ و بہار بنا سکی۔ اس نے دلدلی زمینوں کو جہاں کے پھروں سے لیر یا پھیلتا تھا ختم کر دیا، آبپاشی کے ذریعہ پیدا کر کے خشک ریتیلے میدانوں کو گلزار بنا دیا، ان حصوں کو جہاں کبھی غلہ کا ایک دانہ پیدا نہ ہوتا تھا، ہری بھری کھیتیوں میں تبدیل کر دیا اور ان مقامات میں جہاں لوگ پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترستے تھے نہریں بہا دیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو سکا کہ انہوں نے سب سے پہلے کاشتکاروں کی اصلاح کی، کاشت کے نئے طریقوں سے انہیں آگاہ کیا، کاشتکاروں میں زندگی کا وہ احساس پیدا کیا جس سے وہ اس وقت تک بالکل بے خبر تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین کی بے آب و گیاہ زمین سونا اُگلنے لگی۔

سیاح مذکور کہتا ہے کہ ایران، مصر و عراق سب کو اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے اور اگر

وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں کاشتکار طبقہ کی اصلاح کرنا چاہئے۔
اس نے ایران میں تودہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اپنے ایک سال کے دوران
اقتدار میں آذربائیجان کے اندر کافی اصلاح کرنا چاہی لیکن وہ معمولی سی طہرائی فوج کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔
(حالانکہ کچھ زمانہ قبل اسی فوج کو کاشغائی علاقہ کے قبائل نے شکست فاش دیدی تھی) اس کا سبب
صرف یہ تھا کہ تودہ تحریک کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوئی اور ان کی حمایت نہ حاصل
کر سکی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ کاشتکاروں کی یہ تقسیم حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے گی، غلط ہے، کیونکہ روس میں
بھی کاشتکاروں کی بالکل یہی حالت تھی اور جب ان کا پیانہ صبر پور نہ ہو چکا تو انہوں نے حکومت کا
تختہ الٹ کر رکھ دیا۔

سیاح مذکور لکھتا ہے کہ:- ”ہمارے مدبرین یہ تو سوچتے رہتے ہیں کہ روس کے اقدامات اور
اشتراکیت کی ریشہ دوانی کو کیوں ختم کیا جائے، ایشیا و افریقہ کی انقلابی تحریکوں پر کس طرح قابو پایا
جائے، نئی نئی زمینیں کھود کر معلوم کیا جائے کہ پٹرول کے خیمے کہاں کہاں ہیں، اور جدید مالیاتی منصوبے
قائم کر کے نئی نئی منڈیاں پیدا کی جائیں۔ لیکن غریب فلاح و کاشتکار کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ انہیں
سمجھنا چاہئے کہ اگر زمین کے مسئلہ کو طے نہ کیا گیا تو کاشتکار خود اسے طے کرے گا اور اس کا نتیجہ وہی
ہوگا جو روس میں ہوا اور اب چین میں ہمارے سامنے ہے یعنی اشتراکیت اور صرف اشتراکیت“

(نیاز)

پیش لفظ یہ کتاب ان ملکوں کے حالات پر ہے جو اپنا مستقبل پالینے کی جستجو میں ہیں، یعنی ایران، مصر، عراق و
فلسطین وغیرہ۔ اس کتاب کا موضوع انہیں ملکوں کی آبادی اور سرزمین ہے، وہاں کے شہروں
اور کلچر کا ذکر محض ضمنی طور پر آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہودی فلسطین جس کا نیا نام اسرائیلی حکومت ہے ان قوموں کی
ترقی کے لئے ایک عمدہ مثال بن سکتا ہے، بشرطیکہ وسطی مشرق کی مسلمان قومیں اپنے اپنے ملک کی طبعی حالات کے
پیش نظر اس دستور العمل سے فائدہ اٹھائیں جو اسرائیلیوں نے صحرا و بیابانوں کو سرسبز و زرخیز بنا کر پیش کیا
ہے اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو انہیں ایک سخت خونیں انقلاب کا منظر رہنا چاہئے، جس کا رہرسل ایرانی آذربائیجان میں
بھی ہو چکا ہے۔

یہودی فلسطین آج سے ایک نسل پہلے تک اسی طرح خواب خرگوش میں مبتلا تھا جس طرح عرب فلسطین۔ لیکن
اس مختصر مدت میں اسرائیلی فلسطین میں باوجودیکہ وہ بیرونی اور خصوصاً برطانوی اثرات کا ہدف بنا رہا، حیرتناک

ترقی کرنی ہے اور اس علاقے کی اندرونی ترقیوں کا نہایت مکمل دستور العمل بن چکا ہے، اس کے برعکس مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک جو ابھی تک بیرونی مداخلت سے محفوظ ہیں، اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اندھیرے کو ٹٹول رہے ہیں۔ یہ تصنیف نہ تو سیاسی حجت و بحث ہے نہ تاریخی مقالہ۔ مجھے صیہونی یا عربی فلسفے سے بھی واسطہ نہیں ہے اس کتاب میں میرا واسطہ عربوں، ایرانیوں، مصریوں اور یہودیوں سے صرف انسانیات کا واسطہ ہے۔

فلسطین کا لفظ جن سیاسی اختلافات اور تاریخی موضوعات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جو بین الاقوامی نزاعیں پیدا ہو سکتی ہیں، اس پر نہایت قابل لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن فلسطین کی ریل کمیشن نے ۱۹۷۳ء میں جو رپورٹ شائع کی ہے وہ اس مسئلہ پر نہایت واضح تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ Sumner Welles کی تصنیف *We can not fail* بھی ایک ایسی کتاب ہے جو اس موضوع پر جامع اور دستاویزی شہادت ہونے کے ساتھ ہی برطانوی ذمہ داریوں اور ناکامیوں، امریکن وعدوں اور بدعہدیوں پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

اسرائیلی حکومت کا مستقبل جو کچھ بھی ہو۔ لندن کا دفتر خارجہ اور امپیریل جنرل اسٹاف یہودیوں کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے، مگر اس قوم کا یہ روشن کارنامہ کہ اس نے ریگستانوں کو سرسبز و شاداب باغوں میں بدل دیا ہے کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ خوش قسمتی سے میں آنجنابی *David Ben-Gurion* سے متعارف تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے ایشیائی ملکوں کی پستی کے متعلق ایک نہایت اہم بات کہی کہ ”ان کروڑوں کسانوں کے پاس اگر صرف اتنی زمین ہوتی کہ وہ سال میں ایک جوڑا کپڑوں کا، ایک جوڑا جوتہ، دو بنیان، دو قمیص اور دو موڑے ہی خرید سکتے تو خیال کرو کہ ہم ان کے ساتھ کتنی بڑی تجارت کر سکتے تھے!“۔ دلی خود پانچ زراعتی فارموں کا مالک تھا اس لئے کاشت اور آراخی کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہ کہنا کہ افریقہ و ایشیا کی نہایت پست قوموں کے افلاس کی جڑ آراخی کی غلط تقسیم ہے، نادرست نہ تھا اور اس سے انکار بھی نہیں کہ کروڑوں انسانوں کی زمین سے محرومی اور اسی کے ساتھ پرانے طریقوں اور آلات سے کاشتکاری کے اندر وہ طوفان بھی چھپا ہوا ہے جو چالاکھی کے دھوئیں کی طرح دنیا کے بہت بڑے حصے پر منڈلا رہا ہے اور اس وقت ایران، مصر، عراق اور ایشیا و افریقہ کے دوسرے ملک بھی اس طوفانِ عظیم کے منتظر ہیں۔ — باوجود اس کے کہ اسرائیلیوں کی زرعی پالیسی اور ترقی، اس کی آبادی کی صحت مندی، کاشتکاروں کی پر اُمید زندگی، بلاشبہ ایک مستحکم چٹان ہے مگر انکا اندرونی امن و سکون یقیناً اقلیتیوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ یہودی فلسطین نے جو امن اور خوش حالی حاصل کر لی ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے جسے وسطی مشرق کی مسلمان قومیں حاصل نہ کر سکتی ہوں۔

David Ben-Gurion ایک اسرائیلی گاؤں کا نام ہے۔ میں اس گاؤں کو دیکھنے گیا تھا اور جب میں اس کے

رہنہ کھیتوں میں گھوم رہا تھا، میں نے دیکھا کہ سیاہ چادریں اوڑھتے عرب عورتوں اور بچھٹے پُرانے کپڑے پہنے عرب بچوں کے ہجوم نے ایک یہودی کی گاڑی پر تہ بول دیا ہے۔ میں نے اسے فرقہ باری بلوہ سمجھ کر گاؤں کے سکوپٹری سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ بلوہ نہیں ہے بلکہ جب کوڑے کی گاڑی آتی ہے تو یہ لوگ اس میں سے کچھ کارآمد چیزیں ڈھونڈنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور گودڑ وغیرہ چن لے جاتے ہیں۔

یہودیوں کے پاس کوئی نیا موسیٰ نہیں آیا جس نے اپنا عصا مار کر فلسطین میں پانی کے چشمے جاری کر دئے ہوں، بلکہ یہودیوں نے اسی زمین سے پانی نکال کر صحرا کو سیراب کیا اور زمین کو زرخیز بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایک کے سوا باقی سب دلدلوں کو خشک کر کے طاعون اور ملیریا کو ختم کر دیا ہے جو صدیوں سے عرب باشندوں کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے صحرا اور پہاڑیوں پر اپنا پسینہ اور روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ ایشیاء و افریقہ میں یہودیوں سے زیادہ ہوشیار اور محنتی شاید ہی کوئی ہو۔ ان مقامات کی مردہ زمین میں اس طرح کہیں بھی جان نہیں ڈالی گئی کہ بیابانوں میں روٹی اور پھل اُگنے لگے ہوں۔ انکار رفتہ مولیشیوں کو نئی زندگی دینا، بھڑ، بکریوں اور دیگر مولیشی کو کارآمد و نفع بخش بنالینا اور پولٹری کی افراط اس میں شک نہیں بڑا کارنامہ ہے۔

اسرائیل کے یہودی دولت مند تو نہیں بن گئے ہیں مگر سالانہ ایک جوڑا کپڑا اور جوتا جس کا ذکر و لگی نے کیا تھا ضرور خرید سکتے ہیں۔ یہ بات عرب ملکوں کے لئے خواب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کے صحیح مخاطب چونکہ امریکن لوگ ہیں اس لئے میں نے ایران کے ذکر کو زیادہ جگہ دی ہے۔ میں نے جن ملکوں کی سیاحت کی ان میں ایران سب سے زیادہ دلکش ملک ہے۔ ایک غیر ملکی نے ایران کو ”امریکہ کی لاڈلی“ کا نام دیا تھا۔ بلاشبہ روس اور امریکہ کی کشاکش میں ایران کنجی کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ایران تو امریکہ کی لاڈلی ہونا چاہئے۔

ایک انگریز مصنف (A. C. Edwards) نے لکھا ہے کہ ”ایران میں جو حکومت بھی قائم ہوتی ہے، بیشتر برطانوی یا روسی سفارت خانے کی اشارہ سے قائم ہوتی ہے۔ مجھے اس پر اعتراض ہے۔ کیونکہ غیر ملکی اثر کے اعتبار سے امریکہ، روس اور برطانیہ دونوں پر سبقت لے گیا ہے۔ چنانچہ آج ایرانی فوج کی نئی تنظیم، امریکن فوجی مشن کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور پولیس کو از سر نو منظم کرنے کے لئے بھی امریکہ ہی کا ایک فوجی افسر مقرر کیا گیا ہے۔

امریکہ کے دوست اور دشمن، صحیح یا غلط طور پر ۱۹۷۹ء میں ایران کو صوبہ آذربائیجان میں جو کامرانی حاصل ہوئی اس کا سبب امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وزیر اعظم غضام نے روس سے تیل کی جن مراعات کا وعدہ کیا تھا اور ۱۹۷۹ء میں مجلس نے جشن استقلال کے ساتھ اس روسی مطالبہ کو مسترد کیا، وہ بھی امریکہ کے اثر و نفوذ ہی کا نتیجہ تھا۔

لیکن امریکہ کے اس اثر و نفوذ کے باوجود ایران کا مسئلہ واشنگٹن کے لئے ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے اور آئندہ امریکہ کا یہ اثر رہے یا نہ رہے لیکن میں اپنے یقین کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ ایران کے بارے میں واشنگٹن کو جتنی وسیع اور مکمل معلومات حاصل ہیں ایسی وسط ایشیا کے کسی دوسرے ملک کے بارے میں حاصل نہیں ہیں۔ جارج ایلن کی سفارت کے زمانہ میں، جو خود ایک صحافی رہ چکا تھا۔ اس کے اسٹاٹ کی توجہ سے ایرانی زندگی کا کوئی پہلو مشکل سے بچ سکا۔

کے انجینئرنگ فرم *Mormin Knudsen* کی آٹھ سو صفحے کی رپورٹ ایران کے متعلق اطلاعات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ رپورٹ حکومت ایران کی خواہش پر اس فرم کے ماہروں نے طیار کی تھی، لیکن یہ رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔ مجھے طہران نیشنل بینک کے گورنر نے اس کی کاپی دیکھنے کو دی تھی اور اس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ رپورٹ ایران کی کتنی بڑی خدمت ہے۔ ایران کے متعلق ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان جو معرکہ بھی ہو اور اس ملک میں امریکہ کی موجودہ پوزیشن باقی رہے یا نہ رہے، لیکن جو مواد اور معلومات امریکہ کے پاس ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ایران کے باب میں پریسیڈنٹ کانگریس کوئی غلطی کر بیٹھے تو اس کا سبب یہ نہ ہوگا کہ امریکہ کو یہاں کی بابت کافی اطلاعات حاصل نہ تھیں۔

ان تمام حالات کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت اسرائیلی حکومت ہی تنہا ایسی حکومت ہے جو نہ صرف ایران بلکہ مصر، عراق اور شام وغیرہ کیلئے بھی نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اسرائیلی اصول ترقی جوں کے توں ان ملکوں کے لئے موزوں ہوں گے لیکن یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ یہودی حکومت کو سامنے رکھ کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

فلسطین کے یہودیوں کے بارے میں لارنس آن عربیہ نے تیس سال پہلے لکھا تھا:-

”ان کی (یہودیوں کی) اسکیموں کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوگا کہ موجودہ عرب آبادی خود

ان کی (یہودیوں کی) مادی و اقتصادی سطح پر آجائے۔ یہ کام یہودیوں کی ترقی کر لینے کے فوراً

بعد شروع ہو جانا چاہئے۔ ایسا ہو سکا تو عرب دنیا کے مستقبل کے لئے اہم نتیجے رونما ہو سکیں گے۔“

اسرائیلی حکومت سے عربوں کی دشمنی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، لیکن اب وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہودیوں نے کس کامیابی کے ساتھ اپنے مسائل کو حل کیا اور اسے نظر انداز کر دینا بالکل ایسی بات ہوگی جیسے ڈاکٹر کسی کو ہسپتالین تجویز کرے اور وہ انکار کر دے محض اس لئے کہ اس علاج سے اس کا بڑوسی جس سے اس مرض کی مخالفت تھی شفا پا چکا ہے۔

پہلا باب

(ایران)

دنیا کے سر پر اپنا سفر میں نے جینوا (سوئٹزرلینڈ) سے شروع کیا، اور طہران پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں دنیا کے آخری سرے پر پہنچ گیا ہوں۔ طہران، ایران کا بہت بڑا، نئی وضع قلع کا شہر ہے، جس کی آبادی ساڑھے سات لاکھ ہے، مگر ہوائی جہاز یہاں بہت کم آتے ہیں، کیونکہ اس طرف مسافروں کی آمد و رفت اتنی کم ہے کہ ہوائی کمپنیاں اپنے اڈوں کے مصارف نہیں نکال سکتیں۔

امریکہ کی ہوائی ڈاک ہندو دن سے پہلے تہران میں تقسیم نہیں ہوتی اور کبھی کبھی پورا مہینہ لگ جاتا ہے۔ یورپ کے اخباروں کا تہران کے گلی کوچوں میں بکنا تو بڑی بات ہے، اخبار فروشنڈوں کے ہاں بھی نہیں ملتے۔ اور اگر پہنچتے بھی ہیں تو بہت دیر میں۔ ہاں قریب کے روسی علاقے کے اخبار ضرور آجاتے ہیں، مگر روسی زبان جاننے والوں کے لئے بھی ان میں دنیا کی خبریں خاص ترتیب و سلیقہ کے ساتھ نہیں دی جاتیں۔

دنیا کے حالات سے بے خبری کا احساس جتنا مجھے طہران میں ہوا، کہیں نہیں ہوا۔ جن سیاحوں کی اپنے ملک کے سفارت خانوں تک پہنچ ہوتی ہے وہ البتہ طہران میں دنیا کے حالات و واقعات سے اتنے بے خبر نہیں رہتے کیونکہ ہر سفارت خانہ تازہ خبریں حاصل کرنے کا انتظام رکھتا ہے، لیکن غیر ملکی سیاح جس کی رسائی اپنے سفارتخانہ تک نہیں دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ غیر ملکی زبانوں میں سے صرف فرانسیسی زبان کا ایک اخبار ”روزانہ دو تہران“ یہاں چھپتا ہے۔ مگر اس اخبار میں صحافت کی تمام خوبیاں ہونے کے باوجود دنیا کے تازہ واقعات کی صحیح اطلاع نہیں ملتی۔ چنانچہ میرے قیام طہران کے دوران میں دو مرتبہ یہ افواہ اُڑی کہ روس و امریکہ میں جنگ چھڑ گئی ہے۔

تہران صبح معنی میں مشرق ہے، پُرسکون و خوابیدہ! تہران کو شورش و ہنگامہ بھی بمشکل جنبش دے سکتا ہے۔ اس شہر کے حال و مزاج کا اندازہ یہاں کے فقیروں اور کتوں سے ہوتا ہے: افریقہ و ایشیا کے سارے

فقیروں میں تہران کا فقیر بڑا مسکین و خوش مزاج فقیر ہے۔ یہاں ہر موڑ پر، ہر گلی کوچے میں، میلے کچیلے، لنگڑے لوگ نظر آتے ہیں، کوئی بیساکھیوں پر چل رہا ہے، تو کوئی سکڑا ہوا بڑا ہے، کوئی بے ٹانگوں کے گھسٹ رہا ہے تو کوئی درخت یا دیوار کا سہارا لئے کھڑا ہے، ان کا ٹھکانا راستے اور فٹ پاتھ ہیں، جہاں بیٹھتے ہیں وہیں سو جاتے ہیں اور سوتے وقت اپنی ٹوپی اُلٹی کر کے رکھ دیتے ہیں تاکہ گزرنے والے خیرات کی یاد نہ بھولیں۔ تہران کے فقیر براہ راست سوال نہیں کرتے۔ میرے قیام تہران میں صرف ایک فقیر نے مجھ سے سوال کیا اور دور تک پیچھا بھی کیا۔ اس کے برخلاف قاہرہ کے فقیر جب انھیں مایوسی ہوتی ہے تو بڑا بھلا کہنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

تہران کو شہر نہیں بلکہ ایک تمدن کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا، اور تمدن بھی ایک نہیں بلکہ مختلف تمدنوں کا مجموعہ۔ جس کیفیت کی کاریوں میں یکساں طور پر پانی نہ پہونچے گا پیداوار اتنی ہی ناہموار ہوگی۔ یہی کیفیت تہرانی کلچر کی ہے۔ پرانے بازار تنگ پٹے ہوئے ہیں جہاں نہ گرمیوں کی تپا دینے والی دھوپ تناسکتی ہے اور نہ سردیوں کی برفباری۔ پرانے شہر کی گلیاں ٹیڑھی میڑھی ہیں اور بازاروں میں کافی شور ہوتا رہتا ہے، سردی کے موسم میں دھکتی ہوئی انگلیٹھیاں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں، بو اور خوشبو، جھنکاریں اور راگنیاں، طہران کی قدامت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن پرانی آبادی سے ماہر ہر طرف کشادہ سڑکیں اور خیابان ہیں۔ سڑکوں پر سایہ دار درختوں کی دو رو یہ قطاریں، جھلسا دینے والی دھوپ سے پناہ دیتی اور آنکھوں کو طراوٹ پہونچاتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں خاص طور پر ٹھنڈے پانی کے مشکیزے اُٹھائے، سقے پیاسوں کو پکار پکار کر پانی پلاتے پھرتے ہیں ایران میں دودھ بھی مشکیزوں ہی میں لایا جاتا ہے، اور اس وجہ سے خراب بھی جلدی ہو جاتا ہے۔

ٹیکسی اور بس سروس کا انتظام حال ہی میں ہوا ہے، اور سچ یہ ہے کہ تہران کی یہ سروس بہترین سروس ہے۔ نئی، خوبصورت اور چمکیلی گاڑیوں کا ایک بیڑہ انگلستان سے یہاں پہونچا ہے۔ طہران کی ٹیکسی سروس اس میں شک نہیں قابل رشک چیز ہے۔ البتہ بوڑھا ”در دشتی“ (کوچبان) اس سے خوش نہیں ہے۔

سارے شہر میں ہمہ وقت، یہ تیز رو اور سستی ٹیکسیاں دوڑتی پھرتی ہیں، اور بھروسے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس باب میں سہولت و آرام کے اعتبار سے تہران کو دنیا بھر کے شہروں پر فوقیت حاصل ہو۔ نقل و حمل کی اس خوبصورت و راحت رساں سواری کے ساتھ ساتھ بار برداری کے گدھوں اور اونٹوں کی قطاریں بھی سڑکوں پر دکھی جاتی ہیں، اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ طہران کا چہرہ جوان اور جسم بوڑھا ہے اور یہ کارنامہ ہے رضا شاہ پہلوی کا۔

رضا شاہ اور روسی زار پیٹر اعظم میں مماثلت تام ہے۔ پیٹر کی طرح رضا شاہ ایران کی پستی سے بنیزا ہو کر

اسے یورپ کے سانچے میں ڈھال لینے پر تل گئے تھے، کچے مکان اور چھپر ڈھادے گئے، کچے گچ لگیاں صاف کی گئیں، بدبو دار چٹے اور تالاب خشک ہوئے، اور ان کی جگہ نئی اور عالیشان عمارتیں، سیدھی اور وسیع سڑکیں اور بازار بن گئے۔ پیٹر کی طرح رضا شاہ نے بھی ناراضی و مخالفت کی پروانہ کر کے سختی سے کام لیا، اور جس طرح روس کی آبادی پیٹر سے خوف زدہ تھی اسی طرح ایرانی عوام رضا شاہ سے ڈرتے تھے۔ ایرانیوں نے صدیوں سے زندگی میں اتنا تیز انقلاب نہیں دیکھا تھا کہ سروں کی پگڑیاں دم بھر میں ہیٹ کی صورت اختیار کر لیں، اور لمبی عبا میں کوٹ پہنوں بن جائیں۔ ایرانیوں کے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نقاب پوش خاتونیں دیکھتے دیکھتے نقاب ترک کر کے میم بن جائیں گی!۔

۱۹۲۰ء میں ایرانی عورتیں ریٹوراں اور سینما گھروں میں داخل ہوئیں۔ شروع شروع میں کم عورتوں نے ایسی دلیری دکھائی! لیکن ۱۹۳۰ء میں جب تہران گرل ہائی اسکول کی لڑکیوں نے ورزش کی نمائش کی اور رضا شاہ، معہ اپنی ملکہ اور شہزادیوں کے مغربی لباس میں یہاں آئے تو گو اس واقعہ سے ملک بھر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ اسی روز سے ایرانی رسم و رواج تیزی سے بدلتے لگے۔ کم از کم نئے تہران میں، آج نقاب پوش عورت نہیں دیکھی جاتی۔ اور اگر دیکھی بھی جائے تو خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ نقاب یا تو شناخت کرنے کے لئے ہے یا پھر چہرہ عیب دار ہے۔ اس کے باوجود پرانی عادتیں ابھی تک باقی ہیں! ایرانی مرد عورت ہاتھ میں ہاتھ دیکر نہیں چلتے، بجز ان چند نوجوانوں کے جو یورپ و امریکہ سے تعلیم پاکر واپس آئے ہیں۔

جدید ایرانی عورت ایک غیر ملکی زبان ضرور جانتی ہے اور قہودہ ٹانوں یا باغوں میں اتلی ہی آزاد و بے تکلف نظر آتی ہے جتنی کوئی یورپین عورت۔ لیکن یہ جدید ایرانی عورت کسی دوست بلکہ منگیتر کے ساتھ بھی تنہا تفریح کو نہیں نکلتی۔ باپ یا بھائی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

غیر ملکی سیاح جب تہران میں داخل ہوتا ہے تو شہر کی خوبصورتی اور صفائی سے بہت متاثر ہوتا ہے! شہر و بازار کا نقشہ، جدید اور عالیشان عمارتوں کی قطاریں، وسیع چکیلی سڑکیں، چاقی چو بند پولیس کے سپاہی، یہ سب باتیں اسے یورپ کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن اس حسین و دلکش چہرے کے نیچے وہ سن رسیدہ جھریاں پڑے ہوئے جسم کی جھلک بھی دیکھتا ہے۔

روشن خیال رضا شاہ نے پائے تخت میں نلوں کے ذریعہ سے پانی کی بہر سانی اور حفظانِ صحت کے اصول پر توجہ نہیں کی۔ تہران میں پہاڑوں کا پانی کھلی نالیوں میں شہر کے ہر کونچہ و بازار میں بہتا نظر آتا ہے شہر کی ساری گندگی ان نالیوں میں بہتی ہے اور یہیں کپڑے دھوئے جاتے ہیں، لوگ نہاتے ہیں اور جانور

پانی پیتے ہیں۔

حال میں ایک برٹش انجینئرنگ فرم کو تہران کی آب رسانی اور زمیں دوز بدر رو بنانے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔

تہران کی زندگی میں قدیم ”دیروز“ اور جدید ”فردا“ آپس میں اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں، جیسے کانٹوں کے درخت پر گلاب کی بیل۔ لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی ایرانی قوم نہ تو سست و کاہل ہے اور نہ اس کے اندر شکست خوردگی کا انداز پایا جاتا ہے! کم از کم تہران کا سیاح تو یہی کہے گا۔

جس ایرانی کو دیکھئے سر اٹھائے تیزی سے ہاتھ ہلاتا ہوا چلتا ہے، ایرانیوں کو شائستگی کا خیال ہر وقت رہتا ہے۔ افتاد طبع و مزاج کے اعتبار سے ایرانیوں اور فرانسیسیوں میں مماثلت ہے اور شاید اسی لئے فرانس کی ثقافت و زبان ایران میں زیادہ مقبول ہے۔ ایک ایرانی کتنی ہی خستہ حالت میں ہو، افسردہ و غمگین نظر نہیں آتا، وہ اس وقت بھی اداس نہیں معلوم ہوتا جب وہ اپنے گھریا دوکان پر ڈالتی مارے بیٹھا ایرانی ریڈیو کے غمگین نغمے سنتا ہوتا ہے۔ (مغربی کانوں کو یہاں کی موسیقی اداس ہی معلوم ہوتی ہے)

اوسطاً ایرانی چہرے بدن کا مستقل مزاج انسان ہوتا ہے، موٹا آدمی یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جب نظر آ جاتا ہے تو انگلیاں بھی اٹھ جاتی ہیں، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے باتوں باتوں میں کہا کہ ”ہمارے سب موٹے آدمی پارلیمنٹ میں ہیں“۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ الیکشن میں زیادہ تر تاجر اور زمیندار ہی چنے جاتے ہیں جن کو عمر بھر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا اور عیش و آرام آدمی کو موٹا بنا ہی دیتا ہے ایک طہرانی ادیب سے میں نے سوال کیا :-

”کیا آپ کے ملک میں لوگ خودکشی بھی کرتے ہیں؟“ ————— اس نے جواب دیا

”ہاں مگر بہت کم، کیونکہ ہماری قوم بڑے بڑے دشوار حالات سے گزر چکی ہے، اور کوہ و صحرا نے ہماری زندگی کو صعب و دشوار بنا دیا ہے اس لئے کوئی مصیبت ہمیں مایوس نہیں کرتی، ہم ہر حالت میں بچے جاتے ہیں“ قاهرہ کے بازاروں میں گزرتے وقت وہاں کی بھڑکھڑ اور قہوہ خانوں کی رونق و آبادی دیکھکر میں سوچتا تھا کہ مصری کام کس وقت کرتے ہیں؟ لیکن جب میں تہران کے گلی کوچوں میں گھوما تو وہ سوال اٹا ہو گیا یعنی ایرانی راحت و آرام کس وقت کرتا ہے؟ گرمی کے موسم میں تہران کی تمام دوکانیں زیادہ دیر تک بند رہتی ہیں۔ اس وقفے کے علاوہ میں نے ایرانیوں کو ہر وقت مصروف اور کام کرتے دیکھا۔ شاید کام کرتے رہنا ایرانی خون میں داخل ہے۔ ہر ایرانی جو طبقہ اشراف میں شمار نہیں ہوتا ہر وقت مصروف نظر آئے گا۔

اشراف ایرانی بے شک اپنے ہات سے کام کرنے کو ذلیل سمجھتے ہیں، تاجروں و میندار کی طرح اہل فن و مثلاً (انجینئر وغیرہ) بھی اس بیماری میں مبتلا نظر آتے ہیں اور اپنے ہات سے کوئی کام نہیں کرتے۔ ہر کام کے لئے نوکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایرانی سرمایہ داروں میں آپ کو کوئی ایسا آدمی نہ ملے گا جو امریکی سرمایہ دار کی طرح ضرورت کے وقت آستینیں چڑھا کر کام میں لگ جائے۔ جنگ کے زمانہ میں جب ایران میں امریکی فوجوں کے افسر راستے میں خود اپنی موٹر درست کرنے لگتے تو اس منظر سے ایرانی شرفاء کو حیرت ہوتی تھی۔

جب زر تشرقی تعلیمات پر نظر پڑتی ہے تو جسمانی محنت اور ہات سے کام کرنے سے شرفائے ایران کی یہ بیماری زیادہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے، زر تشرقی تمدن میں محنت و مشقت پر بڑا زور دیتا تھا۔ ہل چلانا، کنواں کھودنا، کاشت کرنا، درخت لگانا اور مویشی پالنا بلند انسانیت کا ثبوت تھے، زندہ اوستا میں لکھا ہے کہ ”جو محنت و توجہ سے زمین بوتا جوتا ہے وہ ایسا ذخیرہ اکٹھا کرتا ہے جو دس ہزار عبادتوں سے افضل ہے“ راستگونی اور مویشیوں کی خدمت اونچے درجے کی نیکیاں تھیں۔ آج کی ایرانی زندگی میں اس ضابطہ اخلاق کی طرف سے بے اعتنائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میرے تہران پہنچنے کے چند ہی دن بعد ایک انگریزی تعلیم پائے ہوئے ایرانی نے مجھ سے کہا:-

”ایرانیوں کے متعلق پہلے تھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بہت جھوٹے ہیں!“

”تم تو جھوٹے نہیں؟“ میں نے مذاقاً کہا۔

”میں ایک ایرانی ہوں!“ اس کا بیخ جواب تھا۔

”یعنی؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

اس نے کہا: ”اگر تم اس کو سمجھنا ہی چاہتے ہو تو تمہیں ہماری قومی تاریخ پڑھنا چاہئے۔ زمانہ تاریخ میں ایرانی قوم نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، بڑے بڑے فاتحوں، غیر ملکی مدبروں اور خود ایرانی حکمرانوں نے قوم کو اتنا رگیدا ہے کہ تحفظ ذات کے لئے جھوٹ سے کام لینا ایک فطری اور موثر حیلہ بن گیا ہے۔ تم شاید مجھ سے اتفاق نہ کرو گے، لیکن اگر ایرانی شاہنشاہوں کے مفتوح ہو جانے اور ایران پر عربوں کے قابض ہو جانے کی تاریخ کا مطالعہ کر لو گے تو میرے ہم خیال بن جاؤ گے۔“

تعلیمیافتہ ایرانیوں میں میں نے یہ قابل تعریف خصوصیت پائی کہ وہ اپنی قومی کمزوریوں کے اعتراف میں تامل نہیں کرتے۔ اور اس اعتبار سے ایرانی تمام مسلم قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ حکومت ایران کے اقتصادی مشیر A.C. MILSPAUGH نے ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر علی دشتی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

”ہمیں خود ستانی کا مرکب نہ ہونا چاہئے اگر کسی نے کسی عہد میں ساری دنیا فتح کر لی تھی تو کیا آج تو

حالت یہ ہے کہ جتنے غدار، و خائن ایران میں ملیں گے کسی دوسری قوم میں نہیں ملیں گے اور جس طرح ایران میں ایسے لوگ قانون کی زد سے محفوظ ہیں ویسے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہونگے!“

ایران کی سیاست میں ریشہ دوانیوں اور دروغ بافیوں نے ایران کے سنجیدہ لوگوں کو اس قدر ہزار کر دیا ہے کہ مجلس کے ایک ممبر نے دوران گفتگو میں مجھے کہا کہ ”میرا کتا البتہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا!“ میری ملاقات ایران کے سب سے پڑھے لکھے افراد اور یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب زرتشتی ضابطہ اخلاق کو زندہ کرنے کے کتنے متمنی ہیں۔ ایک اہل قلم نے ایک بار کہا کہ ”ہماری قوم جب ہی عظمت پاسکتی ہے جبکہ ایک بار پھر زرتشت ہمارے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے لگے!“ میں نے کہا:۔ ”لیکن امتداد وقت کے ساتھ زرتشتی اصول میں بھی تو فرق آگیا تھا!“

اس نے جواب میں کہا:۔

”صحیح کہ ایسا ہوا، لیکن گرا ہوا مکان پھر سے تعمیر کیا جاسکتا ہے: زرتشتی ضابطہ اخلاق ہمارا ”ایرانی مکان“ تھا، ہماری اچھائیوں کا ”ایرانی مندر“ تھا، جسے ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا تھا، اور اس روحانی مسالہ سے بنایا تھا جو ہمارے ہی ملک کا تھا۔ عربوں کی طرح ہم صحرائی انسان نہ کبھی تھے اور نہ آج ہیں۔ اسلام کے اندر بڑی خوبیاں ہیں، لیکن ان خوبیوں کے باوجود اسلام بدویوں کا مذہب ہے۔ ہمارے وہ شعرا بھی جو بڑے سخت مسلمان تھے (جیسے نظامی، سعدی) زندگی کے بڑے شیدا اور رومان کے متوالے تھے۔ وہ اسلامی تقشف کو قبول نہیں کر سکے، ان کی روح ایرانی روح تھی!“

ایران کی سماجی زندگی میں بعض اور بھی خرابیاں ہیں جن کے ذکر سے آجکل کے مغربی سیاح کو بہت دکھ پہونچتا ہے۔ مثلاً ”آپ میرے گاؤں آئے!“ یہ جملہ میں نے ایک ایرانی زمیندار سے اپنے پہلے سفر ایران کے دوران سنا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”آپ کتنے گاؤں کے مالک ہیں؟“ ”میں بائیس گاؤں کا مالک ہوں!“ یہ جواب دیتے وقت میں نے محسوس کیا کہ اس ایرانی زمیندار کو کسی قسم کی ناخوشگوار سی یا بڑائی کا احساس نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ ایران میں غلامی کا رواج نہیں ہے اور زراعتی پیداوار کی طرح کسانوں کو فروخت نہیں کر دیا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اسی فیصدی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے۔ اس لئے اسکے اندر ”ملکیت کا شعور“ جڑ پکڑ گیا ہے۔ ایرانی کسان جہاں چاہے جا بھی سکتا ہے اور تعلیم پا کر اونچے سے اونچے مرتبے تک پہونچ بھی سکتا ہے، لارڈ کرزن نے اپنی قابل ذکر کتاب میں لکھا ہے کہ ”اس اعتبار سے ایران دنیا بھر میں سب سے زیادہ جمہوری ملک ہے کہ وہاں اونچے نیچے کی تفریق مطلق نہیں ہے اور ہر شخص ذاتی جوہر کی بنیاد پر بڑے سے بڑا رتبہ پاسکتا ہے۔“ رضا شاہ کی ذات خود اس کا ثبوت ہے، لیکن ایران کا دیہاتی

اپنی تمام نارسائیوں کے باوجود اپنی جگہ نہیں چھوڑتا، اور یہ جبر بھی برداشت کر لیتا ہے کہ پارلیمنٹ کے چناؤ میں زمیندار کی مرضی کے مطابق ووٹ دے۔ مغرب کے مفہوم میں یہ بات اصول جمہوریت کے منافی ہے۔

میری آخری سیاحت ایران ۱۹۷۷ء میں ہوئی، اور میرے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد میرے ایک ادیب دوست نے مجھے شوقیہ ڈراما کرنے والوں کے ایک جلسہ میں مدعو کیا۔ ہم تھیٹر میں بیٹھے پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے، میرے دوست کا ایک دوست جو نہایت اعلیٰ انگریزی بولتا تھا، ہمارے پاس آیا اور مزاج پرسی کے بعد ادھر ادھر نظر دوڑا کر تماشائیوں کو دیکھا جو بالعموم پتے کھا رہے تھے، اور کہنے لگا ”یہ سب تیسرے درجے کے لوگ ہیں!“ اس کا یہ کہنا نفرت و حقارت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد مجھے یہ بتانا تھا کہ اول درجے کے ایرانی ایسے بدتمیز نہیں ہوتے جو تھیٹر میں پتے کھاتے رہیں۔ بایں ہمہ، اس کا یہ کہنا میرے لئے خاص معنی اور اہمیت رکھتا تھا۔ ایران میں اگرچہ ہندوستان کی طرح نیچے اونچے نہیں ہیں لیکن اول درجے اور تیسرے درجے کے لوگ ایرانی سماج میں بھی ہیں۔ دوسرے درجے والے اول تو وہاں ہیں نہیں اور اگر چند نفوس ہیں تو وہ آسانی سے اول یا تیسرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی سماج میں درمیانی کڑی غائب ہے۔

تہران کافی بڑا شہر ہے مگر وہاں بڑی اور نازک چیزیں نہیں بنتیں، وہاں کی فیکٹریاں بھی ایسی چیزیں طیار نہیں کرتیں۔ صنعتی پیداوار کا بڑا حصہ ہاتھوں اور سادہ اوزاروں سے طیار کیا جاتا ہے۔ ایرانی دماغ فوری ضرورت کے لئے بہت سی چیزیں نہایت خوشنام وضع کی طیار کر سکتا ہے۔ حرفت و دستکاری کا شوق اور مستقل مزاجی ایرانی کاریگر کے مخصوص اوصاف ہیں۔ نئی بسوں کی ”باڈیز“ بھی ہاتھ ہی سے بنائی جاتی ہیں چاندی اور دوسری دھاتوں کی چیزوں پر باریک قسم کی نقاشی، قالین بانی اور چوب کاری کی نزاکتیں خیابان لالہ زار کی دوکانوں میں بکثرت دیکھی جاسکتی ہیں جو سچے چھترناک ہیں۔ پُرانا ایران اہل حرفہ اور دستکار کا ملک تھا اور دنیا میں مشہور تھا۔ نیا ایران بھی دستکاروں ہی کا ملک ہے اور اگرچہ پرانی عظمت و شان کے ساتھ بہت سے فنی تصورات ختم ہو گئے ہیں مگر اصفہان کے سجادار، شیراز کے نقارے اور قالین آج بھی دنیا میں بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔ ایران کی پیداوار بیشتر مضبوط اور چست چالاک ہاتھوں کی مرہون ہے۔ ایک امریکن افسر نے خوب کہا کہ ”تین چوتھائی ملین ایرانیوں میں سے ساڑھے سات لاکھ ایرانی صرف اپنے لئے تجارت کرتا ہے۔ خیابان لالہ زار میں دوکانیں بہت ہیں مگر ڈپارٹمنٹل اسٹور کوئی نہیں ہے۔ کاریگر بوڑھے بچے چیزیں طیار کر کے زیادہ تر خود ہی بازار میں لاتے اور فروخت کرتے ہیں۔

تاہرہ میں شاید اس وجہ سے کہ وہاں غیر ملکی آبادی زیادہ اور ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے، غیر ملکی کتابوں

کی دوکانیں بہت ہیں مگر تہران میں بہت ہیں۔ تہران میں بہت بڑی آبادی کے باوجود چند ہی دوکانیں ایسی ملنیگی جہاں غیر ملکی مطبوعات مل سکیں۔ ایران میں جبریہ و لازمی تعلیم کا قانون جاری ہے لیکن یہ عام تعلیم آج کی حقیقت نہیں، کل کی آرزو ہے! وزیر تعلیم ڈاکٹر صادق کے قول کے مطابق ^{۱۹۵۵ء} میں ساڑھے تین لاکھ سے کم بچے اسکولوں میں جاتے تھے اور بارہ لاکھ نہیں جاتے تھے۔

ایران کی راجدھانی میں سب سے زیادہ مقتدر اور سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار اطلاعات ہے لیکن اسکی اشاعت بھی تیس ہزار سے زیادہ نہیں۔ چار ہزار کی اشاعت والا اخبار بھی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔

ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ غیر ملکی علمی مطبوعات کا بھوکا ہے اور افسانوی ادب سے لگاؤ نہیں رکھتا۔ GONWILL THE WIND ایک ناول ایسا ہے جو دوسرے ملکوں کی طرح ایران میں بھی نہایت مقبول ہے۔ تقریباً پچھتر سال ہوئے جب ناصر الدین شاہ قاجار نے یورپ کا سفر کیا تھا۔ اس وقت سے یورپ، خاص کر فرانس کے مشہور و مستند لکھنے والوں کے تقریباً دو ہزار ناول فارسی زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ پڑھا لکھا ایرانی یورپی اہل قلم کی حقیقت نگاری کا شیداء ہے اور زندگی کی یہ ترحانی اسکے ذہن و خیال کو مسحور کر لیتی ہے۔ اس لئے اسکا مطالعہ وسیع ہوتا رہتا ہے۔ ایرانی نوجوان عقل کی جستجو کے بعد تخیلی ادب سے ہٹ کر سنجیدہ علمی مطالعے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

میں نے ایک مشہور ایرانی مصنف سے سوال کیا کہ ”ایرانی تعلیم یافتہ طبقہ فلسفہ و نفسیات کے مطالعہ کا اتنا شائق کیوں ہے؟“ اس نے جواب دیا ”اس لئے کہ ہم ہنوز سیکھ رہے ہیں، ابھی تک صداقت کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، نئی اور پرانی دونوں صداقتوں کے لئے!“ — ہر ایرانی اپنے قدیم شعراء اور پیشوایان مذہب کا احترام کرتا اور انہرنازاں ہے۔ ہر ایرانی، کلاسیکی شاعری کے وہ حصے جن میں قومی کردار کو سراہا گیا ہے اکثر گنگنا رہتا ہے۔ مائیں بچوں کو لوریاں بھی ایسی ہی شاعری کی سناتی ہیں۔ اچھی قسم کے گپ خانے (چائے خانے) صرف شہروں میں نہیں، دیہات میں بھی ہیں، قصہ خواں نوکر رکھے جاتے ہیں جو لوگوں کو ایرانی شجاعت و بہادری کی داستانیں اور ایرانی فن و سر بلندی کے افکار سنایا کرتے ہیں۔ ایران ایک ایسا ملک ہے جہاں کلاسیکی شاعری سب سے بیش قیمت قومی ورثہ سمجھی جاتی ہے اور یہ جذبہ اعلیٰ و ادنیٰ دونوں طبقوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ لیکن نئی نسل کا ایرانی اس شاعری کے اعلیٰ جذبات و اثرات تصورات سے مطمئن نہیں کیونکہ اس شاعری میں قومی عظمت و ترقی کا نشان اسے نہیں ملتا۔ ایران کی نئی نسل کو شدید احساس ہے کہ نیا زمانہ بڑی طاقت ہے اور اس لئے بیک وقت عذاب بھی ہے اور بشارت بھی! نیا ایرانی جیمز او برگسوں کے ساتھ کارل مارکس کا فلسفہ بھی پڑھتا ہے؟ کیونکہ وہ اس نئے زمانہ کو سمجھنا چاہتا ہے۔ نیا ایرانی نئے زمانہ کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ اسے یقین ہو گیا ہے کہ اسے نہ تو اس نئے زمانہ سے مفر ہے اور نہ وہ اسے بدل سکتا ہے، مگر وہ اس سے بچنا اور اسے بدلنا بھی چاہتا ہے۔

دوسرا باب

(عقل و دانش کا مسکن)

صوبہ فارس کی راجدھانی شیراز، ایرانی قوم کا محبوب و عزیز ترین شہر ہے، اور عقل و دانش کا مسکن سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جسے ایرانی قوم کا گہوارہ کہنا چاہئے۔ ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کے احترام و محبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے لوگ آپس کی بات چیت میں تہران، اصفہان و ہمدان وغیرہ کی عیب جوئی تو کر سکتے ہیں، لیکن شیراز کا نام بے ادبی سے لینے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔ ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کا احترام و اعزاز ایک معبد کی طرح ہے۔ اور اس کی اس تکریم و تحريم کا راز شیراز کی ادبی روایات سے وابستہ ہے۔

ایران کے سب سے زیادہ مقبول و محبوب شاعر سعدی و حافظ تھے جو اسی سرزمین میں دفن ہیں، جنکے مزار آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی زیارت گاہ عوام ہیں۔ یہ دونوں مقبرے ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں لوگ صاحب مزار سے عقیدت کی بنا پر اور اس جگہ کو بہترین تفرج گاہ سمجھ کر جاتے ہیں۔ جمعہ کے روز، ہجوم زیادہ ہوتا ہے اور جا بجا قالینوں کے فرش پر بیٹھے، لوگ سجادہ میں چائے دم کرتے، فنجان کے دور چلتے اور تار و رباب پر کلاسیکی غزلیں گاتے اور سنتے ہیں۔ میرے گاڑی والے نے مجھے بتایا کہ ”یہاں توجہ کے روز آئے!“

سعدی و حافظ کی طرح تیسرا محبوب و مقبول شاعر خیام ہے۔ میں شیراز کے ہوٹل سعدی میں ٹھہرا تھا۔ ہوٹل کے ڈرائنگ ہال میں کسی ایرانی کی قلم کاری کا نتیجہ خیام کی ایک تصویر ٹنگی ہے۔ اس تصویر میں خیام کو ایک سفید ریش بوڑھا دکھایا گیا ہے جس کا عمامہ بھی سفید ہے، لائبریری عیا ہے، سامنے بادہ شیراز کی بوتل ہے اور بغل میں ایک دو شیرو سیاہ کیسہ بکھرائے ہوئے ہے۔ ہم چند آدمی اس تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ایرانی بولا۔

”وہ تھا تو نیشاپوری جو یہاں سے دور ہے لیکن خیام خود شیراز تھا!“

اس ایرانی کا مطلب یہ تھا کہ شیراز عبارت ہے حسن و رومان سے، شیراز رمز و علامت ہے ذہن و ذکاوت کی، شیراز مجسمہ ہے زندگی کی شائستگی و نفاست کا، اور شیراز نام ہے شاعرانہ رموز و کنایات کا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ملایانہ فرمان فرمائی کے خلاف تفلسف کی بغاوت نے شیراز کی صورت اختیار کر لی ہے!

تہران میں مجھ سے ایک تہرانی شاعر نے کہا تھا کہ اب تک تم جتنے ایرانیوں سے ملے ہو، شیرازی ان سب سے مختلف ہیں۔ اور یہ بات سچ نکلی۔ میں شیراز پہنچا تو ایک جوان عمر تاجر سے بھی ملاقات ہوئی، تعارف ہوتے ہی اس نے مجھ سے سوال کر دیا کہ کیا میں شعر کہتا ہوں؟ اور میرے انکار پر اسے حیرت بھی ہوئی۔ میرے سوال کے جواب میں کہ کیا وہ شعر کہتا ہے؟ اس نے کہا:۔ ”بلاشبہ! شیرازی سب شاعر ہوتے ہیں!“

اس کے خیال کے مطابق ایک پڑھا لکھا شیرازی شعر نہیں کہتا تو یا تو وہ پڑھا لکھا نہیں ہے یا شیرازی نہیں ہے۔ سعدی و حافظ، ہر چند بہت مقبول و ممتاز ہیں، لیکن ایرانی قوم اپنے تمام شاعروں سے محبت کرتی ہو خیام، فردوسی اور نظامی بھی بے انتہا مقبول ہیں۔ یہ سوال ہر سوچنے والے کے دماغ میں آتا ہے کہ ایرانی اپنے شعراء سے ایسی غیر معمولی محبت و عقیدت کیوں رکھتے ہیں۔ اس سوال کا جواب غالباً اس حقیقت کے اندر پوشیدہ ہے کہ ایرانی زندگی سے محبت کرتا ہے، اور اسلامی نقشف کو اس روح سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اور چونکہ ایرانی شعراء نے اپنے شعر میں ایرانی روح سمو دی ہے اور اسلامی نقشف سے بغاوت کی ہو اسلئے ایرانی عوام اپنے باغی شعراء اور انکی شاعری کے شیدا ہیں۔ ایسے شعراء میں حافظ و خیام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ایرانی شاعری میں زندہ دلی و خوش باشی کو بہت سراہا گیا ہے، لیکن اس کے اندر سماجی مقصد اور روحانی ارتقاء کی تعلیم بھی دیکھی ہے۔ چنانچہ ایران میں جب بھی کوئی ترقی پسندانہ تحریک اُٹھتی ہے تو حافظ کے اشعار اس تحریک کے نعرے بنتے ہیں۔ کیونکہ حافظ جس خوش باشی کی تعلیم دیتا ہے، وہ چند منتخب لوگوں کی خوش باشی نہیں بلکہ عامۃ الناس کی خوش باشی ہے! وہ ہر انسان کو خوش و خرم دیکھنے کا آرزو مند ہے۔

شیراز کی آبادی ایک لاکھ ہے۔ افلاس، ایران میں عام ہے مگر شیراز کی خصوصیت ہے۔ اسکے باوجود شیراز، ایران کے تمام شہروں میں سب سے زیادہ زندہ دل شہر ہے۔ یہ ایران کا ادبی مرکز و کلچری مستقر ہے۔ اس میں وہاں کے جغرافیے نے بھی مدد کی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور شہر سے میل بھر نکل جائے تو قسم قسم کے وحوش و طیور اور خوبصورت درخت دیکھنے میں آئیگا شیراز کا گلاب آج بھی اتنا ہی حسین و دلفریب ہے جتنا حافظ کے عہد میں تھا، اور وہاں ببل اب بھی پہلے ہی کی طرح غزلخواں ہے! شیراز کی سطح مرتفع، ہوا خوشگوار، مطلع صاف اور سورج چمکیلا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی کسی قوم میں شیرازیوں کی سی زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور خود داری نہیں ملے گی۔ شیراز میں برقعہ پوش عورت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسفہان و تبریز کی طرح شیراز کی عورتیں بھی بالعموم تعلیم سے بے بہرہ ہیں، اور ہر قسم کی روشن خیالی سے محروم ہونے کے باوجود برقعہ اوڑھنے پر راضی نہیں۔ یہ عقیدہ عام ہے کہ شیرازیوں کا خون اب تک خالص اور بے میل ہے۔ چنانچہ شیرازی عورت کی خوبصورتی سارے ایران میں عظیم المثال ہے اور ایک ایرانی کا یہ قول خاص اہمیت رکھتا ہے کہ: ”ان کو مغربی لباس پہنا دیجئے، پھر دیکھئے!“

ہر چند شیراز میں افلاس بہت ہے لیکن اس افلاس کے شیرازیوں کے حسن و جمال کو متاثر نہیں کیا ہے۔ شیرازی عورت میلے کچیلے لباس میں بھی قمر طلعت نظر آتی ہے۔ اس کی غلافی سیاہ آنکھیں، سفید موتیوں سے دانت اور باریک نرستے ہوئے خدو خال اور شگفتہ روئی اس کی خصوصیات ہیں۔

شیرازی عورتیں بکثرت اور بلا شک و شبہ دوکاندارہی کرتی اور سودا بیچتی ہیں۔ ایران کے دوسرے شہروں میں یہ بات نہیں ہے، مینے دیکھا ایک بوڑھی عورت سودا بیچتے میں بے مکان سگریٹ بیٹی جاتی ہے۔ راستہ اور بازار میں پیشہ ور عورتیں لوگوں کو اس بے تکلفی کے ساتھ مخاطب کرتی اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے سگریٹ کی فرمائش کرتی ہیں، جس طرح یورپ کے بڑے شہروں میں۔

شیراز کو اپنی قدیم عظمت اور ثقافتی سرزندگی، اپنے دلنریب مضافات و ماحول، اپنے شہریوں کی زندہ روئی اور زندہ دلی کے باوجود ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی خوشحالی و شادابی کا انحصار ”آب رکن آباد“ پر تھا، جو اب سوکھتا جا رہا ہے۔ تیس سال سے پہلے رضا شاہ کے حکم سے بندر بوشہر بند کر دیا گیا۔ یہ حکم گویا شیراز کو پچھانسی دینے کا حکم تھا۔ کیونکہ بندر بوشہر کی تجارت کا راستہ شیراز ہو کر تھا۔ رضا شاہ کو ایرانی اگر برا کہتے ہیں تو صرف اسی ایک تصور کی بنا پر۔ کہا جاتا ہے کہ بندر بوشہر کھپڑ سے کھول دینے کے سوال پر غور ہو رہا ہے۔ گو رضا شاہ کے حکم سے شیراز کو یہ نقصان پہونچا، مگر دوسری طرف وہاں کے تاجروں اور زمینداروں نے رنہا عام کے وہ کام بھی کئے جن کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ شیراز کے بازار کشادہ و خوبصورت بنائے گئے اور واٹر ورکس قائم کیا گیا۔ یہ وہاں کے پیسے والوں کی عالی ہمتی کا نتیجہ تھا۔

پورے صوبہ فارس کی آبادی بیس لاکھ ہے اور یہ علاقہ سب سے زیادہ زرخیز اور ہرا بھرا ہے۔ فارس کی سرزمین ہر قسم کی زراعت کے لئے موزوں ہے، لیکن آبپاشی مفقود ہے، رکن آباد کو خشک ہوتے دیکھ کر کنویں کھدوانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ایک یورپی انجینئر نے پہلا کنواں کھودا تو فی کھنڈ میں ہزار

گیلین پانی دینے لگا۔ ایران کی عام پکار پانی کی ہے، حالانکہ زیر زمین پانی کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ شیراز کو بھکاریوں کا چھتہ کہنا، مبالغہ نہ ہوگا۔ ایران کے دوسرے شہروں میں اپنا بچ اور ناکارہ لوگ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر شیراز میں کنبے کے کنبے یہی پیشہ کرتے ہیں۔ بوڑھے، جوان، عورت، مرد اور بچے ٹولیاں بنا کر مانگتے ہیں۔

شیراز میں مزدوروں کی گنتی سچا س ہزار ہے، جس میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے صرف دو ہزار ہیں سرکاری محکموں میں اگرچہ تین ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں مگر ان میں نصف تعداد خالتو ہے پینتیس ہزار ایسے ہیں جو گھروں میں رہ کر کوئی نہ کوئی چیز بناتے اور سد رمق حاصل کرتے ہیں۔ باقی دس ہزار سرکاری اطلاع کے مطابق بے روزگار ہیں۔

شیرازی، شعر شاعری کے شیدا ہیں، لیکن اس فوق دہانہاک کے باوجود نوے فیصدی آبادی بے پڑھی لکھی ہے۔ سارے شہر میں صرف دو سینما ہیں اور ایک طائفہ شوقیہ ڈراما کرنے والوں کا ہے۔ یہ شوقین ڈراما کرنے والے سب کے سب جدید تعلیم یافتہ ہیں۔ شیراز میں اخبار تو آٹھ نکلتے ہیں لیکن ان کی مجموعی اشاعت تیس ہزار سے زیادہ نہیں، روزانہ ایک بھی نہیں ہے۔ پوری آبادی کے لئے صرف دو ہائی اسکول ہیں۔ کالج ایک بھی نہیں۔ برٹش کونسل نے ایک اینگلو ایرانی انسٹی ٹیوٹ جاری کر رکھا ہے۔ اسکی لائبریری ممبروں کے لئے کھلی ہے۔ یہ تنہا ادارہ ہے جو جدید کچھ کی ترویج کر رہا ہے۔

میرے شیراز پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہاں کے نوجوانوں نے جن کو جدید تعلیم ملی تھی میرے خیر مقدم میں ایک کارڈن پارٹی دی۔ یہ لوگ انگریزی یا فرانسیسی بھولی بولتے تھے اور یورپی رقم و قواعد سے پوری طرح واقف تھے۔

میں خاموش ایرانیوں اور وسطی مشرق کی دوسری قوموں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ایرانی جب دوستی کر لیتا ہے تو پھر نہایت دلکش طریق پر اور حیرت انگیز حد تک صاف بیانی سے کام لیتا ہے۔ فصاحت بیان ایرانی قوم کا جو ہر خصوص ہے، مگر اسی درجہ پر اس کی خود تنقیدی بھی ایک خصوصیت ہے۔

اس شام کو میں نے جس پارٹی میں شرکت کی تھی، وہاں خوش باشی اور گپ زنی کے سوا کوئی بات نہ تھی لیکن اس وقت بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایران کی یہ نئی نسل ایک عدالت ہے۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے کردار و گفتار کی جانچ ہو رہی تھی اور بڑے بڑے عہدہ داروں کی بد اعمالیوں کی گرفت کی جا رہی تھی۔ دفعۃً یہ نوجوان مجسٹریٹ کہنے لگا:۔

”آپ جانتے ہیں، میں ایک اچھا مسلمان ہوں مگر مسجد میں کبھی نہیں جاتا! اس لئے کہ مجھے ملا سے

سخت نفرت ہے۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگا۔ ”میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں ترک وطن کا ارادہ کر رہا ہوں، کیونکہ وطن کے اندر حالات سخت حوصلہ فرسا اور مایوس کن ہیں۔“

”کہاں جاؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔

”کہیں بھی، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ، کینیڈا یا آپ کے وطن!“

یہ نوجوان ایرانی دل شکستہ تھا اور ایران میں ایسے بہت ملیں گے۔ بہت سے تو ترک وطن کر چکے ہیں اور بہت سے امید پر جی رہے ہیں۔ لیکن جو لوگ دوسرے ملکوں میں بس چکے ہیں وہ بھی منتظر ہیں کہ کوئی عوامی تحریک اُٹھے جس میں غیر ملکیوں کا ہاتھ نہ ہو تو وہ وطن واپس آکر اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنا فرض ادا کریں!

”من ویزدال“ کا پہلا حصہ

سولہ ماہ پہلے جنوری کی ۲۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانیت کو ”انسانیت کبریٰ“ کا رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں تمام کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند انشا اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۴۲ صفحات - مجلد - سات روپیہ آٹھ آنے (مع) علاوہ محصول۔

”من ویزدال“ کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:-

اصحابِ کہف — معجزہ و کرامت — انسان مجبور ہے یا مختار — مذہب، عقل — طوفانِ نوح —

خضر کی حقیقت — مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں — یونس اور دہانِ ماہی — حسن یوسف کی داستان —

قارون — سامری — علم غیب — وحی کی حقیقت — دعا و توبہ — لقمان — عالم برزخ —

یا جوج ماجوج — ہاروت ماروت — حوض کوثر — نور محمدی اور پل صراط — آتشِ فردوس —

نفس دروج — آدم اور شجر ممنوع — لفظ اُتی کا صحیح مفہوم — معاد و غیرہ — ضخامت ۲۲۴ صفحات

کاغذ سفید و دبیر — قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے — مینجر نگار۔ لکھنؤ

تیسرا باب

(شہسواری کی طاقت)

ایران کے صوبہ فارس میں ایک پہاڑی علاقہ کاشغی قبیلے کا مسکن ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ (ایران کا خیال) ہے، قبیلے کا خان یا سردار ناصر خان ہے جو جدید قسم کی تعلیم سے نا آشنا اور غیر ملکی زبانوں سے بالکل ناواقف ہے۔ اس کے تین بھائی اور ہیں۔ ایک بھائی حسین کاشغی ایرانی مجلس کا ممبر ہے اور انگلستان و جرمنی کا تعلیم یافتہ ہے، انگریزی اور جرمن نہایت اچھی بولتا ہے۔ ایک ملاقات میں میں نے اس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں شیراز جا رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ ساتھ ہی کاشغی علاقے کی سیاحت بھی کر سکوں۔ میں یہ سن چکا تھا کہ شاہ ایران کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی امریکن سیاح قبائلی علاقے میں جائے اور شاہ نے یہ بات حسین اور دوسرے بھائیوں کے گوش گزار بھی کر دی تھی میں حسین کاشغی سے اس بات کی تصدیق بھی کر لینا چاہتا تھا کہ میرے دوران سفر میں سیاسی مداخلت تو نہیں کی جائے گی۔ حسین نے شاہ ایران کی نارضا مندی کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ”آپ کب جانا چاہتے ہیں آپ کے سفر کا سب انتظام ہو جائے گا“ یہ امر واقعہ ہے کہ تہران اور فیروز آباد (کاشغی نظام کے مرکز) کے درمیان کچھ اس قسم کی دشمنی ہے کہ وہ جب ضرورت سمجھیں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیں اور جب بات چیت سے نتیجہ نہ ملے تو توپ بندوق کی زبان میں گفتگو کرنے لگیں۔

اس قبیلے کو دبانے کی رضا شاہ نے انتہائی کوشش کی تھی۔ اس وقت ان بھائیوں کا باپ زندہ اور سردار قبیلہ تھا۔ اس کو اور بڑے بیٹے ناصر خاں کو جیل میں ڈال دیا تھا۔ باپ جیل میں مر بھی گیا۔ اور اس کے بھائی آج تک اس کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کے باپ کو زہر دیا گیا تھا۔ اس کا بدلہ کاشغی قبیلے نے ۱۹۷۶ء میں اس طرح لیا کہ بغاوت کی اور حکومت کی فوجوں کو زیر کر لیا۔ وجہ یہ تھی کہ صوبہ فارس میں فوج کی تعداد زیادہ نہ تھی اور جتنی تھی وہ زیادہ طاقتور نہ تھی۔ کاشغی، بندر بوشہر اور خلیج فارس کا علاقہ

فتح کر کے شیراز پر بڑھنے والے تھے، مگر شیرازیوں کی الحاح و زاری پر رحم کر کے قبضہ اٹھالیا۔ ایک ذمہ دار کا شغلی لیڈر نے بتایا کہ یہ جنگ اس مطالبے کے لئے کی گئی تھی کہ آذربائیجانی باغیوں کا قلع قمع کیا جائے اور صوبہ فارس میں کا شغلی قبیلے کو خاص رعایتیں دی جائیں۔ کا شغلی باغیوں کی ہر کامیابی سے نوجوان شاہ کو صدمہ ہونا قدرتی بات تھی۔ اور ایرانی فوج کے جرنیلوں کے لئے ذلت کا موجب تھا اسی لئے تازہ کمک بھیجی جا رہی تھی اور ممکن تھا کہ باغیوں کی سرکوبی اسی طرح ہو سکتی۔

مگر کسی خاص وجہ کی بنا پر ارباب حکومت نے مصالحت کر لینا ہی بہتر سمجھا۔ غرض، حسین کا شغلی نے ایک ذمہ دار آدمی میرے ساتھ کر دیا اور ہم فیروز آباد کے سفر پر روانہ ہو گئے پہاڑی راستہ دشوار گزار تھا۔ اور ہماری موٹر کو ایسے موقع بھی پیش آئے کہ میرے روٹے کھڑے ہو ہو گئے جب میں فیروز آباد پہنچا تو محسوس ہوا کہ میں ہزاروں سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں اور جدید دنیا خواب و خیال بن گئی ہے۔

یہ علاقہ سورج کی گرمی سے جھلسا ہوا بیابان ہے اور جہاں تہاں خیموں اور چھوٹا دیواریوں کی بستیاں آباد ہیں۔ بھیتوں کے گٹھے ہیں اور یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہیں۔ اونچے پہاڑوں کے بیچ میں وسیع وادی کا یہ علاقہ قبیلے کے باقی نے غالباً جنگی مصالحتوں کی بنا پر منتخب کیا ہو گا۔ اس علاقہ پر اچانک حملہ ہو جانا ناممکن ہے کا شغلی لوگوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔ یہ لوگ بلا کے جفاکش، بے مثل شہسوار اور غضب کے نشانہ باز ہیں۔ ان کا رہنا سہنا خیموں کے اندر ہے اور قالینوں کا فرش ان کا انتہائی تعیش ہے۔ ان لوگوں کو قدامت سے عشق ہے اور جدید تمدن کی ہر چیز سے نفرت۔ یہ لوگ جتنے قدامت پرست ہیں اتنے ہی دلکش بھی ہیں۔ جس شدت کے ساتھ وہ بیرونی دنیا سے ہیزا رہتے ہیں اتنے ہی اپنے عیبوں یا محاسن پر مصر ہیں۔ جاڑوں کے موسم میں یہ لوگ اپنے اونٹوں، گدھوں اور بھیتروں کو فلیج فارس کے علاقہ میں لے آتے ہیں اور گرمیوں میں شمالی علاقہ میں لے جاتے ہیں۔ گویا وہ باروں مہینے سورج کی روشنی میں رہنا چاہتے ہیں۔

میں نے جب پہلی بار ان لوگوں کو اپنے تیز اور چھپل گھوڑوں پر سوار دیکھا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ لوگ نے ہی سپاہیانہ زندگی کے لئے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے کے کاندھے پر ہندوق شکلی نظر آتی۔ قدرتی طور پر ہر کا شغلی اول نمبر کا شکاری ہے۔ ان کی شہسواری روسی کا سکوں کی یاد دلاتی ہے۔ ہر گھر میں کم سے کم ایک ہندوق اور ایک گھوڑا ضرور ہونا چاہئے۔

ان لوگوں کی زبان فارسی نہیں بلکہ ترکی ہے۔ مگر ایران پرستی میں یہ لوگ اپنے تئیں کسی ایرانی سے کم نہیں ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ الگ تھلک زندگی گزارتے ہیں اس لئے ایران کے لوگ ان کو براے نام ایرانی

کہتے ہیں، اور اس سے کاشغی خفا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر حکومت تہران انھیں غیر مسلح کرنا چاہتی ہے، جس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو بھی چکی ہے مگر یہی بات اس کے لئے درد سر بھی بن گئی ہے۔

کاشغی نہ تو وحشی ہیں اور نہ انھیں غیر مہذب کہا جاسکتا ہے۔ تعلیم بالکل نہیں لیکن حد درجہ متواضع و خلیق ہیں۔ بات بہت دھیمے لہجے میں کرتے ہیں جو تمدن سماج میں کمال شائستگی کا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔

میرے لئے بڑے بھائی ناصر خاں کا مکان کھول دیا گیا۔ وہ خود تہران میں تھا۔ مگر کوئی تواضع ایسی نہ تھی جو اٹھا رکھی گئی ہو۔ یورپ کی شرابیں بھی فراہم تھیں۔

میں اکثر ان لوگوں کی خیموں کے کیمپوں میں چلا جاتا تھا۔ عورتیں غیر ملکیتوں سے بھی پردہ نہیں کرتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو کامل آزادی حاصل ہے، وہ شہسواری بھی کرتی ہیں۔ البتہ خانگی مصروفیات کی بنا پر شکار کو نہیں جاتی ہیں، ان عورتوں کی خود اعتمادی انتہا کی ہے اور پوری مسلم دنیا میں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں اور عام ایرانیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کاشغی تہذیب ایران کے گم شدہ تمدن کے صحیح نشانی ہے۔ میں نے ان کی عورتوں کی آزادی، خود اعتمادی اور مردوں سے مساوات دیکھ کر ایک کاشغی سردار سے کہا:۔

”یقین نہیں آتا کہ یہ مسلم عورتیں ہیں!“

اس نے اپنی زبان میں میرا خیال ان عورتوں کو سنایا جو اس وقت وہاں موجود تھیں اور ایک شادی کی تقریب میں جمع ہوئی تھیں وہ سب تہقہہ مار کر ہنس دیں۔

کاشغی اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ کٹر مسلمان بھی ہے اور یہ لوگ اپنے ایمان و عقیدہ کے لئے جان تک قربان کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے یہاں ملا کی دوکان نہیں لگنے دی، اسی لئے مذہبی تقشف ان میں نہیں پایا جاتا۔ کاشغی لوگ عام طور پر پڑھ لکھ نہیں سکتے، مگر قرآن ضرور گردن میں حایل ہوگا کیونکہ اس کی برکت سے بلائیں رو ہوتی ہیں۔ شراب بالکل نہیں پیتے۔

اسلام میں چار بیویاں تک جائز ہیں، مگر ان میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے والے شاذ ہوتے ہیں اور حقارت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسلام میں عورت کا نکاح ثانی ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنی لڑکیاں غیر کاشغی سے نہیں بیاتے کیونکہ وہ طلاق دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذلت کی بات ہے۔ چنانچہ اس قوم میں طلاق بھی اتنی ہی شاذ ہے جتنی ایک سے زیادہ بیوی رکھنا۔ اس قبیلے کے سردار چار بھائی ہیں لیکن انہیں سے صرف ایک شادی کاشغی عورت سے ہوئی ہے۔

لڑکی کی شادی بالعموم سولہ سال سے پہلے ہی کر دی جاتی ہے، مگر مرد شادی میں جلدی نہیں کرتے

کیونکہ یہ لوگ شادی کو ایک قسم کا قید و بند سمجھتے ہیں۔ ایک کاشغی نے مجھے بتایا کہ:-
”آدمی یا تو بیوی کا انتخاب کرے یا بندوق کا“

ایک موقع پر میں اپنے کاشغی رہنما کے ساتھ جارجیا تھا کہ ایک جگہ شادی کی تقریب نظر آئی۔ میرے ساتھی نے بلا محابا بھڑکے اوپر بندوق کے دو فیر کئے۔ میرے حواس گم ہو گئے۔ گھر میں نے دیکھا کہ وہ قبضے لگا رہا تھا۔ خوشی کے موقعہ پر ان لوگوں میں بندوقیں داغی جاتی ہیں۔

کاشغی عورتیں بھی دوسری مشرقی عورتوں کی طرح شوخ رنگوں کو پسند کرتی ہیں اور اس کو ہستانی پس منظر میں ان کے رنگ برنگ سرسبز اور لباس بہت دلکش معلوم ہوتے ہیں۔

سارے ایران میں کاشغی لوگوں کی تندرستی بہتر ہے۔ یہ علاقہ ٹائیفاؤڈ، چیچک اور میربا کی ہلاکت محفوظ ہے۔ دق کا مرض البتہ ہے جو وہاں کے جغرافیہ اور آب و ہوا کا نتیجہ ہے۔ ان لوگوں میں اعصابی اور داغی مریض سنے نہیں گئے حالانکہ جدید تمدن میں ایسے مریض ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی غذا سادہ ہوتی ہے۔ اور ان کی ضروریات محدود ہیں۔ چائے۔ شکر ان کی سب سے بڑی عشرت ہے جو مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

ایک کاشغی خان سے میں نے پوچھا کہ کیا ان کے قبیلہ میں خودکشی کے واردات ہوتے ہیں؟ وہ میرے سوال پر حیران رہ گیا اور بولا کوئی خودکشی کیوں کرتا ہے؟ محبت میں ناکام رہنے یا زندگی کے ناقابل برداشت ہو جانے پر۔ ہمارے یہاں نہ تو پہلی صورت ہے نہ دوسری۔ اگر کوئی کاشغی مصیبت میں پڑ جائے تو سب مل کر اس کی مدد کرتے ہیں اور اسے بھوکا نہیں مرنے دیتے۔ زندگی میں انتشار و بے حوصلگی، مثنیٰ تمدن کی خصوصیت ہے، مگر کاشغی قوم اس سے متاثر نہیں اس لئے انتشار سے بھی واقف نہیں ہے۔

اس قوم کی جنگجو یا نہ مصروفیات کی بنا پر امریکی مشین نے حکومت ایران کو مشورہ دیا تھا کہ انھیں جندرمہ کے افسری اسکول میں داخل کیا جائے۔ اس تجویز کی تہ میں یہ بات تھی کہ پہلے پولس اور پھر فوج میں کاشغی لوگوں کا داخلہ قومی دفاع کو مضبوط بنائے گا۔ لیکن ایرانی جرنیلوں نے اس اسکیم کو خطرناک سمجھا کیونکہ کاشغی قبیلہ خاص طور پر ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنی جگہ خود ایک فوج ہیں اور اپنی جنگی طاقت کو قائم رکھتے ہیں۔

میرے قیام شیراز کے زمانہ میں، ایک نامور و قدیم خاندان کے فرد نے مجھے اپنے باغ میں چائے کی پارٹی دی۔ اس باغ کو دیکھ کر مجھے یقین کرنا پڑا کہ ایران اپنے باغات پر کیوں فخر و غرور کرتا ہے۔ یہ پارٹی نہایت پُر لطف و دل خوش کن صحبت تھی۔ ایرانی قوم نہایت مہذب و شائستہ ہے، ان کی صحبت نہایت پُر لطف

ان کا طرزِ ماند و بود نہایت نفیس، ان کی فطرت جمال پرستی اور گفتگو ذہین و اثر انگ ہے! جب میں اس پارٹی سے واپس ہوا تو چند لوگ مجھے ہوٹل تک پہنچانے آئے۔ موٹر میں انہوں نے ذکر کیا کہ جلسہ سے چند گھنٹے قبل میزبان کے یہاں ڈاکہ پڑا تھا۔ لیکن میزبان نے مہمانوں کی دلداری کے خیال سے پارٹی کو ملتوی نہیں کیا۔ قبائلی لوگ ایسا اکثر کرتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں نہ اسپتال ہیں نہ ڈاکٹر، نہ اسکول ہیں نہ ریڈیو۔ اور نہ کہیں سینما ہے۔ عام حالت یہ ہے کہ خوش حال کاشتچی معلم رکھ کر اپنے لڑکوں کو تعلیم دلاتے ہیں، لڑکیوں کے لئے تعلیم غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کاشتچی بھی شاعری کے اتنے ہی شیدا ہیں جتنے دوسرے ایرانی۔ شاہنامہ ان کی مقبول کتاب ہے اور اس کے حصے جو شجاعت و قوم پرستی کے جذبات اُبھارتے ہیں، ہر کاشتچی کو زبانی یاد ہیں۔ ایک سال پہلے حکومت تہران کی فوجوں سے مقابلہ ہوا تھا تو کاشتچی عورتوں نے شاہنامہ کے اشعار سنا سنا کر کاشتچی جنگجو یوں کو جنگ پر اُبھارا تھا۔ ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ:-

”ان لوگوں (کاشتچیوں) کی رات جب اوپر چاند اور تارے چمکتے ہوتے ہوں اور نیچے ریگستان میں جہاں تہاں چو لھوں کی آگ روشن، بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے۔“ مجھ جیسے سیاح کے لئے ان لوگوں کی زندگی میں بڑی کشش پائی جاتی ہے، ایک آزاد زندگی، زمین سے محبت، فطرت سے قریبی تعلق، جدید تمدن کی الجھنوں سے بے تعلق، مختصر و سادہ ضرورتیں! کس قدر دلچسپ باتیں ہیں، لیکن آج کی دنیا، سائنس اور مشین کی دنیا، تمام اقوام کو متاثر کر رہی ہے اور کرے گی۔ آج بھی دنیا میں زبردست قوم زیر دست پر جبر و تشدد کر رہی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ کاشتچی اور ایران کے دوسرے قبائل کب تک الگ تھلگ رہیں گے! صحیح اعداد و شمار موجود نہیں مگر اندازہ کیا گیا ہے کہ ایران کی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی میں تیس چالیس لاکھ کے درمیان قبائلی ہیں اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ متحد و پُر امن زندگی کے رستے پر ڈالے جاسکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خانہ بدوشی میں مست ہیں۔ آج حکومت اور قبائلیوں کے درمیان جنگ نہیں ہے، لیکن اسے امن کی حالت بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ قبائلی ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ فوجی خدمت کے لئے نہایت مناسب ہیں لیکن حکومت ان پر اعتبار نہیں کرتی۔ ملک کے اندر رشوت کا بازار گرم ہے اور بیرونی طاقتیں بین الاقوامی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ اس لئے حکومت تہران کے خلاف ان قبائل کو بغاوت پر آمادہ کر لینا دشوار نہیں ہے۔

البتہ اعلیٰ تدبیر کی پالیسی اس خلیج کو پاٹ سکتی ہے جو تہرانی حکومت اور قبائل کے درمیان حائل ہے

اگر ان کی جنگی اسپرٹ سے اپیل کی جائے تو قبائلی لوگ وفادار فوجی بن سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فوجی افسر اپنے ماتحتوں پر جبر کرنے اور ان سے رشوتیں لینا چھوڑ دیں۔

کاشغی علاقے سے واپسی پر تہران میں میں نے پہلا کام یہ کیا کہ شیخ قبیلہ ناصر خاں سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ اپنے قبیلے کے مستقبل کے متعلق اس کا کیا خیال ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ: ”آپ ہمارے علاقہ میں گھوم کر آئے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ باقی تمام ایرانیوں کے مقابلے میں ہم لوگ بہتر زندگی گزار رہے ہیں، ہم آزاد ہیں، ہم نے اپنی عورتوں کو دبا کر نہیں رکھا ہے، ہماری صحت سائے ایرانوں سے بہتر ہے۔ ہمیں نہ زمیندار کا ڈر ہے نہ جندرمہ کا خوف! جب ہمارا ملک ایران ترقی کی اس منزل پر پہنچے گا کہ تمام کاشتکاروں کے پاس فولاد سی ہل ہوں، دیہات میں بجلی پہنچ جائے، ڈاکٹر دستیاب ہونے لگیں، اسپتال کافی بن جائیں، لوگوں کے رہنے کو مناسب مکان ملیں، پینے کو صاف اور عمدہ پانی ملے اور پولس کے جبر و تشدد کا خاتمہ ہو، اس وقت کاشغی خانہ بدوشی ترک کرنے پر سوچ سکے گا۔“

میں نے اسے توجہ دلائی کہ :-

”آپ مانیں گے کہ کاشغی لوگ اس سے بہت زیادہ کر سکتے ہیں جتنا وہ کر رہے ہیں، اور ان کی بڑی قوت ضایع ہو رہی ہے، انھوں نے مولشیوں کے چرانے کے لئے لاکھوں ایکڑ آراضی کو چرا گاہیں بنا کر کھا ہوا جہاں غلہ، پھل اور ترکاریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اس پہ بھی غور کیجئے کہ صحیح علاج دستیاب نہ ہونے سے کتنے مولشی ضایع ہو جاتے ہیں!“

اس نے کہا :- ”میں مانتا ہوں کہ مولشی کے علاج کے لئے ہم کو سلو تری میسر نہیں ہیں، اور نہ صرف جانور بلکہ معالجہ نہ ہونے سے آدمی بھی ضایع ہوتے ہیں، لیکن ہمارے علاقہ میں کوئی بہکاری تو نہیں ہے۔“ ناصر خاں کی دلیلیں پختہ ہیں اور جھٹلائی نہیں جاسکتیں۔ لیکن جس طرح امریکہ کے قدیم باشندے نئی زندگی میں کھپ گئے ہیں، اسی طرح ایک دن کاشغی اور دوسرے ایرانی قبیلے بھی خانہ بدوشی کو خیر باد کہیں گے۔

مالہ و ماعلیہ

جوش، جگر، سیلاب وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی وہ بھی ایسی ناش غلطیاں کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ فن شعر کتنا نازک فن ہے اور بڑے بڑے شاعر بھی کبھی کبھی اس میدان میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ سرورق رنگین، قیمت دور و پیہ علاوہ محصول۔ مینبر نگار

چوتھا باب

(چاول کا گاؤں)

ایک یورپی مصنف جس نے کافی مدت ایران میں قیام کیا تھا، کہتا ہے کہ:-

”ایرانیوں کو خلق و تواضع کی تعلیم درکار نہیں، یہ وہ ماں کے پیٹ سے ساتھ لاتے ہیں۔“

میری ایرانی سیاحت میں اس قول کی تصدیق ہر جگہ ہوئی، ایک بار میں ایک نوجوان ایرانی کے ساتھ جو کیمبرج کا تعلیم یافتہ تھا، بحر قزوین (اسپین) کے ساحلی علاقے کی سیاحت کو گیا۔ یہ علاقہ گیلان کہلاتا ہے۔ ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ایک مکان کے سامنے دو نوجوان لڑکیاں دھان کوٹ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان لڑکیوں نے کام روک دیا۔ کپڑے جھاڑنے اور چہرہ صاف کرنے میں لگ گئیں، بالکل اسی طرح جس طرح یورپ کی کسی گاؤں کی لڑکیاں باہر کے لوگوں کے آجانے پر کرتی ہیں۔ سرکارو مال کھول کر جھاڑا اور پھول بانڈھ کر مسکراتے ہوئے ہمیں سلام کیا۔ پھر چند بچے بھی آگئے اور انھوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایسے صاف ستھرے بچے میں نے کسی ایرانی شہر میں نہیں دیکھے تھے۔ ان سب بچوں نے ہمیں سلام کیا۔ غیر لوگوں کے آجانے سے ان کو بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی یورپ کے بچوں کو ہو سکتی ہے۔ ان بچوں کی آنکھوں میں روشنی اور چہرے پر بشارت تھی، اور اجنبیوں سے مطلق مرعوب نہیں تھے۔

اس کے بعد ہی گھر کا مالک اندر سے باہر آیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی اور اس طرح ایرانی تہذیب کے مطابق ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بچوں کی ماں تھی۔ اس نے بھی بڑی خندہ روئی اور سنجیدگی کے ساتھ رسم سلام ادا کی۔ اور فوراً دونوں لڑکیاں بھی آگئیں۔ اتنی دیر میں انھوں نے منہ ہاتھ دھو کر بال سنوار لئے تھے اور سر کے رومال خوبصورتی کے ساتھ بانڈھ لئے تھے۔ یہ لڑکیاں ایک کرسی لیکر آئیں۔ یہ کرسیاں گھر کے اندر استعمال نہیں ہوتیں بلکہ جب روضہ خوانی ہوتی ہے تو اس وقت کام آتی ہیں یا کوئی مہان آجائے تو استعمال کی جاتی ہیں۔

ماں نے چپکے سے ان لڑکیوں سے کچھ کہا اور وہ مسکراتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئیں۔ پھر واپس آکر جہانوں کے سامنے ایک نے چھوٹی سی میز لگا دی اور دوسری نے چائے کی پیالیاں چن دیں۔ ہم مالک خانہ سے باتیں کر رہے تھے کہ اس کی بیوی اندر گئی اور ایک پلیٹ میں خربوزے کی قاشیں سجا کر لے آئی۔

اس قدیم رسم تواضع اور مہمانداری میں جذبات سے سوا بھی ایک بات ہے جو تخیل اور منطق پر مبنی ہو ساتھ کھانے پینے سے اجنبیت رفع ہو جاتی ہے، میزبان و مہمان کے درمیان ارتباط کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ بحر قزوین کا یہ ساحلی علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ پھل اور گھنے سایہ دار درخت بکثرت ہیں۔ مکان کے صحن کی دیوار ٹٹی کی تھی اور صحن کے اندر بھی متعدد درخت تھے۔ یہاں مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ بنے ہیں اور درمیان میں درختوں کی آڑ بھی پائی جاتی ہے۔

یہاں میں نے جس قسم کے مکان دیکھے، ویسے ”نیم مہذب ملکوں“ میں کہیں نہیں دیکھے، عمارت کا سارا سامان مقامی پیداوار سے تعلق رکھتا ہے جو مفت یا بہت ارزاں مل جاتا ہے، یعنی مٹی، لکڑی اور پیال۔ ان دیہاتی انجنیروں کی تعمیری صلاحیت دیکھ کر ایرانیوں کی تخلیقی محنت سے محبت کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ افلاس اور جہالت کے باوجود اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود اپنے ہی ہاتھ سے بنالیتے ہیں ان کے مکان دوہرے ہوتے ہیں، ایک حصہ گرمیوں کے اور دوسرا سردیوں کے استعمال کے لئے۔ سارے کام ایک بڑے کمرے میں ہوتے ہیں۔ دوسرا کمرہ بالعموم سامان رکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ اسی کمرے میں کھانا پکتا ہے اور وہ دھوئیں سے کالا ہو جاتا ہے۔ میرے کہنے پر کہ دھواں آسانی سے نکالا جاسکتا ہے، بتایا گیا کہ دھواں قصداً مکان کے اندر رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ چاول کی طیاری میں کام آتا ہے۔

بحر قزوین کا یہ علاقہ نہایت زرخیز ہے مگر طیر یا گھر ہے۔ مکافوں میں چٹائیوں اور قالینوں کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں ہوتا، مجھے سارے ایران کی عورتوں سے زیادہ اس علاقے کی عورتوں نے متاثر کیا۔ گیلانی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ ان کے دانت غیر معمولی طور پر سفید آنکھیں بادامی، پلکیں دراز، پتلیاں نیلی ہیں اور ان میں سے نکلنے والی نظریں زندہ محسوس ہوتی ہیں۔ بال زیادہ تر سنہرے ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سے ہر ایک سلیقہ مند ہوتی ہے۔ انھیں اپنی شخصیت کا بھی پورا احساس ہے اور سب خصوصیات کے ساتھ وہ مسلم عورتیں ہیں۔

کاشتکاری کا سارا بار گیلانی عورت کے کندھوں پر ہے۔ کاشتکاری کا سارا کام بہت پرانے ڈھنگ کا ہوتا ہے۔ اب تک لکڑی کے ہیں۔ فصل کاٹ کر سروں پر اٹھا کر گھراتی ہیں۔ شاڈونا در کسی کے پاس گھوڑا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں گاڑی ٹھیلہ کو کوئی نہیں جانتا۔

میں نے زمیندار کے کارندے سے سوال کیا کہ کیا اس علاقے میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا رواج ہے تو اس نے بتایا کہ ”ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کھیتی کے کام میں زیادہ سہولت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو البتہ وہ دوسری شادی کا خیال کر سکتا ہے“

میں نے سوال کیا کہ ”اگر کوئی دوسرا نکاح کرے تو پہلی بیوی کیا کہتی ہے؟“

بولا:۔ ”وہ کوشش تو یہی کرتی ہے کہ دوسرا نکاح نہ ہو، یکے بھی چلی جاتی ہے، لیکن پھر آ جاتی ہے۔“

میرے اس سوال پر کہ طلاقیں بھی ہوتی ہیں، اس نے جواب دیا:۔

”بہت کم، بات اصل یہ ہے کہ گیلانی عورت بہت کام کرتی ہے اس لئے مرد ایسی غلطی کرتا ہی نہیں

مرد بہت نرمی برتتا ہے۔“

میرے میزبان نے مجھے بتایا کہ:۔

”گیلان بھر میں ایسا گاؤں کوئی دوسرا نہیں ہے، مقابلہ یہاں کے کسان خوش حال ہیں۔ اپنے قول کی

تائید میں اس نے ایک کچی سڑک کی طرف اشارہ کیا جو گاؤں کو بڑی سڑک سے ملاتی تھی۔ یہ کچی سڑک گیلانی

سے ذرا چوڑی تھی، یہ گاؤں کسی موسم میں شہر سے کٹ کر علیحدہ نہیں ہو جاتا کیونکہ یہاں تک سڑک پائی جاتی ہے،

اور آمد و رفت باروں میں جاری رہتی ہے۔ گیلان کے دوسرے گاؤں سڑک نہ ہونے کے باعث بعض موسم میں

شہروں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ پل نہ ہونے کے سبب سے جب ندیاں چڑھتی ہیں تو ذرائع آمد و رفت منقطع ہو جاتے

ہیں اور اس زمانہ میں گاؤں والے طبی امداد اور معمولی دواؤں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔“

یہ سڑک اس گاؤں کے زمیندار نے بنوائی تھی اور اس وجہ سے لوگ اسے بہت اچھا سمجھتے تھے۔ اس

سڑک کے علاوہ گاؤں والوں کی خوشحالی کا ثبوت ان کے لباس سے بھی ملتا تھا، چند بچوں کے سوا میں نے کسی کو

نگے پاؤں نہیں دیکھا۔

گیلان میں بٹائی کا طریقہ رائج ہے۔ لیکن فصل کا آدھا غلہ منے کے علاوہ کسان کو کچھ دوسری رعایتیں

بھی حاصل ہیں۔ گھر کے ساتھ ایک باغچہ ہوتا ہے جس میں پھل اور ترکاریاں ہوتی جاتی ہیں، ٹماٹر، کھیر،

خربوز، لہسن، پیاز وغیرہ بوائے جاتے ہیں۔ اس کا لگان کچھ نہیں دینا پڑتا، پھر جنگلوں میں شکار بہت

ہے اور کسان اپنی قربان سے شکار کر لیتا ہے۔ کوئی ممانعت نہیں ہے۔

میں جس زمینداری میں گیا تھا اس کا مالک تہران میں رہتا ہے، میری ملاقات اس سے وہیں ہوئی۔ اور

وہ پورے وسطی مشرق میں سب سے زیادہ رحمدل اور بامروت زمیندار سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے علاقے میں

اکثر جاتا رہتا ہے اور اپنے پہونچنے کی اطلاع بازار میں ٹوٹس لگا کر کر دیتا ہے اور کسانوں کی فریاد بھی سنتا ہے

وہ انگریزی اور فرنیچ زبانیں بخوبی بولتا ہے۔ اس نے اپنی زمینداری میں پختہ عمارت بنوا کر اسکول جاری کر رکھا ہے جس میں پچاس بچے پڑھ رہے تھے۔

ایران کی زراعتی پستی موت کے بچے کی طرح پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ اس خوش حال گاؤں میں بھی ہل تو بے شک جانور کھینچتے ہیں، باقی تمام کام صرف ہاتھ سے انجام پاتے ہیں۔ گیلان کا پورا علاقہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ ساری آبادی کا مدار چاول پر ہے۔ میرے سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ اوسطاً ہر خاندان ڈھائی ایکڑ سے زیادہ کاشت نہیں کرتا کیونکہ دھان کی فصل بہت محنت چاہتی ہے۔ اس میں سے کسان کو آدھا چاول ملتا ہے جو تیس، چالیس ”بوشل“ کے درمیان ہوتا ہے۔ قرض ادا کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کے بعد اس کے پاس موسم بہار کے ختم ہونے سے پہلے غلہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ نیا قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے قرض کا سود دو گنا تک ہوتا ہے۔ اس مخصوص گاؤں کے بھی سب کسان مقروض تھے۔ اس گاؤں کے لوگوں کی خوش پوشاکی امریکہ سے آئے ہوئے پرانے اور استعمالی کپڑوں کی بدولت تھی۔ اکثر ایرانی امریکہ کے ممنون ہیں کہ وہ انھیں کپڑا پہننے کے قابل تو کر دیتا ہے۔ ایک کسان نے مجھ سے کہا کہ ”سڑکیں نہ ہونا، قرض اور بخار ایران کی تین لعنتیں ہیں“ خود اس گاؤں کے نوے فیصدی باشندے میرا کاشکار تھے۔ اور ان میں صرف چند ایسے تھے جنھیں کوئین نصیب تھی۔

اس علاقے کے جنگلوں میں خود رو پھلوں کی کثرت ہے۔ میرے سوال پر کہ لوگ ان پھلوں کا جام (مرتا) بناتے ہیں، جواب ملا کہ ”شکر کہاں سے آئے؟ چائے کے لئے تو شکر میسر نہیں، جام کون بنائے؟“

یہ گاؤں مجھے ایسا بھایا کہ میں وہاں دوبارہ گیا۔ دوسری دفعہ میں اس روز پہونچا جب وہاں ہاٹ لگ رہی تھی۔ آدمیوں کی ایک بڑی بھیڑ اکٹھا تھی اور ایک میلے کی سی صورت تھی، گو وہاں کھیل تماشے مطلق نہ تھے دوکانیں تھیں اور دوکانوں میں سامان تجارت تھا۔ بہت سے ایسے تھے جو بعض چیزیں خریدنا چاہتے تھے مگر خرید نہ سکتے تھے۔ لیکن سب خوش تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ انھیں افلاس کا ملال ہے نہ قرض کی فکر۔ نہ بخار سے پریشانی ہے نہ سڑک بننے کی آرزو۔ بس باہم ایک جگہ اکٹھا ہو جانا ہی ان کی مسرت کے لئے کافی ہے۔ میلوں میں لڑائی جھگڑا ہو جانا یورپ میں عام ہے، کیونکہ لوگ شراب کی بدستی میں جھگڑ پڑتے ہیں لیکن چونکہ مسلمانوں میں شراب ممنوع ہے اور یہاں شراب کی کوئی دوکان بھی نہ تھی اس لئے یہاں کے میلہ میں نے لڑائی جھگڑا نہیں دیکھا، ان کی تنہا مسرت آپس کی بات چیت تھی یا پھر چائے کا دور۔ علاقہ کا زمیندار غیر معمولی طور پر بھلا آدمی تھا مگر اس کا کارندہ اس کا بالکل عکس تھا۔

اس علاقے کے لوگوں نے عمر میں ایک ہی دفعہ سینما دیکھا تھا، اور وہ بھی اس وقت جب جنگ کے

زمانے میں برٹش قونصل کی طرف سے انتظام ہوا تھا۔ آس پاس کے کوئی تین ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اس فلم کا چرچا وہاں آج بھی ہے۔ میں نے کچھ لوگوں سے سوال کیا ”کیا وہ پھر سینما دیکھنا پسند کریں گے“ تو ایک نے جواب دیا کہ:

”کیا ہی اچھا ہو — مگر!“

”مگر کیا؟“ میں نے کہا۔

”بعض شاید اسے پسند نہ کریں! کیونکہ سینما دیکھ کر ہم لوگ کچھ سیکھ جائیں گے!“

”وہ کون ہو سکتا ہے — کارندہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے —“

”زمیندار؟“ میں نے پھر کہا۔

”ہو سکتا ہے —“

جس مکان میں ہم لوگ بیٹھے تھے، ایک پڑوسی یہ سن کر کہ کوئی امریکن آیا ہے، بے بلائے آگیا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ کام کے علاوہ تفریح کی اور کیا صورتیں ہیں۔ تو اس نے بر ملا جواب دیا ”بیماری!“ اسے تو یہ ہنس کر کہا مگر اس جواب کے اندر بڑی تلخ حقیقتیں پوشیدہ تھیں۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہاں کوئی گاڑی ٹھیلہ کیوں نہیں ہے ایک نے جواب دیا کہ:-

”آپ کی اطلاع غلط ہے: زمیندار کی موٹر بھٹیوں ہی پر چلتی ہے! اور شاید صرف اس لئے کہ

وقت ضرورت وہ اس میں بیٹھ کر فرار ہو سکے!“

اس صحبت میں ایک ایسے زمیندار کے متعلق جس کی لوگ تعریف بھی کرتے ہوں، تیز تیز فقرے سن کر مجھے حیرت سی ہوئی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ:

”تو وہ تحریک سے پہلے یہ لوگ ایسی باتیں کرنا جانتے بھی نہ تھے۔“

تو وہ تحریک ختم کر دی گئی لیکن لوگوں کو بے چین ضرور بنا گئی ہے۔ کوئی دہقان اقرار نہیں کرے گا کہ اسے تو وہ پارٹی سے تعلق ہے یا وہ ایسے خیالات رکھتا ہے کیونکہ ہر آدمی کارندے سے ڈرتا ہے۔ اور تو وہ کا نام لینا بھی خطرہ کی بات تھی۔

زمیندار کا کارندہ بہت زیادتیاں کرتا تھا، اور اگر زمیندار کے علم میں یہ باتیں آ بھی جاتی تھیں تو وہ ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کیونکہ کارندے کی سخت گیری وصولیابی کی ضامن تھی۔ اس گاؤں میں کارندے کی شکایت کرنے کی کسی کو ہمت ہو ہی نہ سکتی تھی کیونکہ شکایت کا بدلہ بہت سخت ہوتا

تھا۔ پانی بند کر دینا تو پہلی سزا تھی۔ اس لئے لوگ اسی میں عافیت سمجھتے تھے کہ کارندے سے بگاڑ نہ کریں۔
 قودہ تحریک کے مطالبوں میں پہلا یہ تھا کہ کاشتکار کا حصہ زیادہ ہونا چاہئے۔ طبی امداد اور تعلیم عام اور
 مفت ہو، سب کو روزگار دیا جائے، اور جندرمہ کو موقوف کر دیا جائے۔ اس آواز نے ایرانی خاص کر گیلانی کسان
 کی روح کو جگا دیا ہے۔

تہرانی حکومت نے غفلت نہیں کی اور کسانوں کا حصہ زیادہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ سارے زمینداروں
 نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔
 میرے ساتھی نے بتایا کہ:-

”ہمارے علاقے میں چاول، چائے، تمباکو، جوٹ اور ریشم کی قیمتی پیداوار ہوتی ہے۔ اور ہم اس کو بڑھا
 بھی سکتے ہیں۔ آراضی کی استعداد بھی بہت بڑھائی جاسکتی ہے۔ لیکن زمینداروں کو پروا نہیں اور کسان میں ایچ
 نہیں۔ چاول کی کاشت میں مشینوں سے اسی طرح کام لیا جاسکتا ہے۔ جیسے آپ امریکہ میں لیتے ہیں۔ لیکن ہم ایسا
 نہیں کر سکتے۔ ہم ملیر یا کو بھی ناپید کر سکتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے!“

حکومت کے پاس پیسہ نہیں اور کسان تلاش ہے اور زمیندار اپنی دولت غیر ملکوں میں عیاشی کی زندگی بسر
 کرنے میں خرچ کر رہا ہے!“

”اس اہل کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب دیا ”کون بتائے؟“

جمہورستان

(مازہ ادلشن)

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، قدرت بیان
 اور پاکیزہ خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی
 نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈلشن میں
 متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈلشنوں میں نہ تھے قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول
 میجر نگار لکھنؤ

پانچواں باب

(ابر آلود مطلع)

ایرانی آذربائیجان کا مستقر تہذیب ہے اور دوسرا بڑا اور اہم شہر ہے۔ میری تہذیب کی سیاحت نہایت تازگی بخش ثابت ہوئی۔ وسط گریما میں تہذیب کا موسم تہران سے زیادہ خوشگوار تھا، ہوائی جہاز سے اترتے ہی پہاڑوں کی خنک و خوشگوار ہوا کے مسلسل جھونکے ایک بہشتی تحفہ معلوم ہوتے تھے۔ آفتاب کی حرارت طہران کی طرح تیز نہ تھی۔ شمالی ایران میں سفر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ آذربائیجان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایرانیوں اور آذربائیجانیوں کا فرق محسوس ہوا۔ آذربائیجانی صرف نسلی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ جسمانی ساخت میں بھی ایرانیوں سے مختلف ہیں۔ انکا قد دراز، جسم بھاری اور رنگ کھلتا ہوا ہے۔ وہ زیادہ جفاکش اور زیادہ بنجیدہ ہوتے ہیں۔ روسی اور ایرانی آذربائیجان کے لوگ ہم نسل و ہم زبان ہیں۔ دونوں علاقے ترکی بولتے ہیں۔ اندازِ کلام میں بنجیدگی، حرکات میں سہولت پائی جاتی ہے اور آسانی سے ہنس دیتے ہیں۔

لیکن باوجود اس اختلاف کے آذربائیجانی ایرانیوں سے کم متواضع نہیں ہیں۔ میں نے ایک سینما میں دیکھا کہ فلم کے گانے کے ساتھ تماشائی خود بھی گانے لگے۔ بازاروں کا گشت کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ گارہے ہیں۔ آذربائیجانی بھی ایرانیوں کی طرح شاعری کے شیدا ہیں۔ ان کے مقبول و ممتاز شاعر فاضل بغدادی اور حاج رضا اشرف ہیں۔

آذربائیجان کے لوگ خود دار بہت ہیں۔ حد یہ ہے کہ ایک آذربائیجانی گداگر غیر آذربائیجانی سے کبھی بھیک نہ لگا۔ ایران کے مشنری ادارے تہذیب میں بھی کام کر رہے ہیں اور یہ حقیقت ماننا پڑے گی کہ مشنریوں نے آذربائیجان کے سماجی سدھار میں بڑی خدمت کی ہے۔ تہران میں ایک تعلیم یافتہ خاتون نے مجھ سے کہا کہ ”آپ کی مشنری ہماری ”روحانی نجات“ کے لئے آئے تھے لیکن انھوں نے ہماری مادی بہبودی کا کام بھی کیا ہے۔“ امریکن اور برٹش مشن مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن تعلیم پھیلانے میں انھوں نے بہت کامیابی حاصل کی۔

۳۹ء میں رضا شاہ نے ان مشنریوں کو ممنوع قرار دے دیا، حالانکہ تعلیم یافتہ ایرانیوں کو اقرار تھا کہ مشنری تعلیم گاہوں کے مقابلے میں ایرانی تعلیم گاہیں ہیچ تھیں۔ چنانچہ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے بند ہو جانے سے ایران کو سخت نقصان پہونچا اور روشن خیال ایرانی اس پر متاسف ہیں۔

تبریز میں پریس بیڑیاں مشن اسپتال سارے آذربایجان مشہور ہے۔ اس اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر چارلس لام ہے۔ یہ ۳۱ء میں آذربایجان آیا تھا۔ اُسے مقامی زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ سارے آذربایجان کے علاوہ ایک طرف گیلان اور دوسری طرف کردستان کے ملحقہ علاقوں سے بھی مریض آتے ہیں۔ ڈاکٹر لام نے نرسوں کی ٹریننگ کا بھی ایک اسکول جاری کر رکھا ہے اس اسکول سے ٹریننگ پائی ہوئی نرسیں اور دائیاں سارے ایرانی اسپتالوں میں کام کر رہی ہیں۔ جب یہ اسکول جاری ہوا تو مسلم ماں باپ نے اپنی بچیوں کے لئے غیر مذہب والوں سے میل جول بڑھانا اور نرس بنکر رات رات بھر گھر سے غیر حاضر ہونا، اچھا نہیں سمجھا۔ لیکن ڈاکٹر لام کی ہر دل عزیزی نے اس مورچے کو آسانی سے فتح کر لیا اور یہ مخالفت زیادہ دن قائم نہ رہ سکی۔

چونتیس برس کی جانفشانی کے بعد بھی ڈاکٹر لام آذربائیانیوں کی صحت میں نمایاں بہتری پیدا نہیں کر سکا، اس لئے کہ پانی کی بہم رسانی حفظان صحت کے اصول پر نہیں ہے اور کلوریم ڈالنے کی مشین کہیں نہیں ہے۔ زمین دوز بد رو بنانے کا خیال تک نہیں کیا گیا اور پبلک حمام جہاں تمام لوگ ایک ہی حوض میں غسل کرتے ہیں، متعدی امراض کو پھیلاتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے چیچک، ٹائیفائیڈ اور آنکھوں کی بیماریاں عام ہیں لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ وہ لال دوا سے پھل اور ترکاریاں دھو لیا کریں تو وہ کہتے ہیں مزا خراب ہو جائے گا۔

ایرانیوں کی طرح آذربائیانی بھی اعلیٰ درجے کے دستکار ہیں، قالین بانی، چاندی سونے کا کام اور چمڑے کی دستکاریوں میں صنایع کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ انھیں ایرانیوں کی طرح باغ لگانے کا ذوق نہیں ہے۔ تبریز کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے مگر ایک قصبہ معلوم ہوتا ہے، حالانکہ ایک نسل پہلے تک بڑی تجارتی منڈی تھا۔ شہر میں رونق و خوبصورتی یا جدید تمدن کا نشان نہیں، سارے شہر میں صرف ایک لائبریری ہے، کل ۳۴ ٹیلیفون ہیں، ایک روزانہ اخبار ہے جس کی اشاعت پوری ہزار بھی نہیں، دوسرا سہ روزہ ہے، اس کی اشاعت اتنی بھی نہیں ہے، ایک تیسرا اخبار بھی نکلتا ہے جس کی اشاعت کا کوئی وقت ہی نہیں ہے، غرض پورا علاقہ تو کیا، شہر میں بھی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی ہے۔

زار شاہی زمانہ ہی سے تبریز ایک مصلاتی شہر رہا ہے جس کی ہر چیز چیخوت کے ناولوں کا زمانہ اور انکے

مناظر میں کرتی ہے۔ یہاں کھانے بھی روسی قسم کے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں کیونکہ سلاوی لوگ ہمسایہ ہیں۔ عام طور سے روسی زبان بولی سمجھی جاتی ہے۔ روس کا یہ اثر تعجب کی بات بھی نہیں جغرافیائی قربت ہونیکے ساتھ تجارتی تعلقات بھی گہرے رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ آذربائیجان بنیادی طور پر ایرانی ہی ہے، بازار سارے مسقف ہیں، دستکاریاں بھی تمام ایرانی ہیں، اہل حرفہ کے اوزار بھی وہی ہیں — اور رہنے سہنے کے طریقے بھی ایرانی ہیں۔

تبریزی میں مجھے سب سے زیادہ حیرتناک بات یہ نظر آئی کہ وہاں کی مسلم عورتیں حد درجہ شریعت و محتاط ہیں۔ رضا شاہ نے پردہ ترک کر دیا تھا مگر تبریزی عورتوں نے پھر اختیار کر لیا ہے، ان کی چادر (یا برقعہ) سیاہ ہوتی ہے اور ان سیاہ پوش عورتوں کی وجہ سے بازار ماتم خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک پردہ ہی نہیں اور بہت سی پرانی رسمیں جو حکماً ترک کرادی گئی تھیں پھر اختیار کر لی گئی ہیں، رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دوکانیں خواہ وہ غیر مسلموں کی ہی ہوں بند رکھی جاتی ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد سے چونکہ ایرانی حکومت بین الاقوامی معاملات میں زیادہ الجھی رہی اس لئے ملاؤں کو قدامت پرستی اور مذہبی تنگ خیالی کی تبلیغ کرنے کا کافی موقع ملا ہے۔ ملاؤں کی یہ تحریک شروع میں خفیہ رہی مگر چونکہ نوے فیصدی آبادی جاہل ہے اس لئے ملاؤں کی مذہبی تحریک زور پکڑ گئی ہے عورتوں میں جتنی جہالت زیادہ ہے، یہ تحریک ان میں اتنی ہی زیادہ تیزی سے مقبول ہوئی ہے، حد یہ ہے کہ فیکٹری کے مزدور بھی اس سے متاثر ہیں۔

میرے قیام اصفہان کے زمانہ میں پارچہ بانی کے ایک کارخانہ کے مزدوروں نے ایک ایسے مزدور کو ہر طرف گردینے کا مطالبہ کیا جس نے دوسرا مذہب اختیار کر لیا تھا، اور مل کے ذمہ دار اس مطالبہ کو مان لینے کو طیار بھی ہو گئے تھے، مگر ایران کی مشنریوں نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ مذہبی اقلیتوں کے حقوق پر دست درازی کا مترادف ہوگا، اس لئے مقامی حکام نے اس مطالبے کو رد کر دیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ شیراز کے قریب ایک گاؤں میں ہوا تھا جہاں عیسائیوں کے دس خاندان بستے تھے ملاؤں کے درغلانے پر کچھ مسلمان لاریوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچے اور رات میں عیسائی گھروں پر ہتھ بول دینا چاہتے تھے مگر وہاں کے مکھیا اور مسلم آبادی نے عیسائیوں کی حمایت کی۔

ایرانی آذربائیجان کا دوسرا بڑا شہر رضایہ ہے۔ جب سلاطین میں آذربائیجان کی نئی خود مختار حکومت ختم کر دی گئی تو اس وقت بعض مسلم مذہبی دیوانوں نے عیسائیوں کے چار گاؤں کو آگ لگا دی اور بعض گاؤں

میں مال بھی لوٹا۔ ان علاقوں کے بعض عیسائی لیڈروں نے مجھے بتایا کہ ان حالات سے مجبور ہو کر وہاں کے عیسائیوں نے ہجرت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور انھیں توقع تھی کہ امریکہ و برطانیہ میں انھیں پناہ مل جائے گی یہ مذہبی دیوانگی تہران کی پرانی آبادی میں زیادہ تھی جہاں زیادہ مزدور اور چھوٹے دوکاندار رہتے ہیں، میں نے خود بھی دیواروں پر ایسے پوسٹر لگے دیکھے جن میں بے نقاب عورتوں کو اہانت آمیز لفظوں سے مخاطب کیا گیا تھا۔ بعض دوکاندار تو عریاں چہرہ والی عورت کو ”ننگی“ کہتے اور ان کے ہاتھ سودا بیچنے سے انکار کر دیتے تھے۔ بے نقاب عورتوں کو بازاروں کی مسجدوں سے نکالا بھی گیا۔

مگر اسی کے ساتھ روشن خیال مذہبی پیشوا جو تمام مسلم ممالک میں سب سے زیادہ ترقی پسند ہیں، ایسے تعصب اور مجنون ملاؤں سے اتنے ہی سیزار ہیں جتنا ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ خفا ہے۔ ان بالغ نظر ایرانیوں کو یقین ہے کہ ان ملاؤں کی ہمت افزائی اوپر سے ہو رہی ہے۔

مذہبی تعصب کی تبلیغ کا اثر اس حد تک ہوا کہ ایک فوجی افسر جس نے ہٹلر کی جرمنی میں تعلیم پائی ہے، ایران کی معاشری خرابیوں اور فوجی کمزوریوں کا افسوس کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا کہ:

”اپنی حفاظت کے لئے ہمارے پاس ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ مذہبی تعصب ہے، ہمیں اس ہتھیار کو تیز رکھنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ یہ اسکی ذاتی رائے ہو، اور ممکن ہے کہ یہ کوئی طے شدہ پالیسی ہو، مگر مجھے جتنے تعلیم یافتہ اور روشن خیال ایرانیوں سے تبادلہ خیال کا موقع ملا وہ سب اس خیال پر مبنی تھے۔

ایرانی ملاؤں کو مذہبی منافرت پھیلانے میں جو کامیابی آذربائیجان اور خاص کر تبریز میں ہوئی وہ ایران کے دوسرے علاقوں میں نہیں ہوئی۔ یہ علاقہ پینتالیس لاکھ آبادی کا علاقہ ہے جہاں کسانوں کی اکثریت اپنی زمین کی خود مالک ہے۔ جھیل آرمیا اسی علاقے میں ہے جو اسی میل لانی اور کم و بیش پچیس میل چوڑی ہے۔ اس علاقہ میں پانی بافراط ہے۔ پہاڑی ندیاں علاقے کو بخوبی شاداب رکھتی ہیں اور زیر زمین بھی پانی کی کمی نہیں۔ بعض جگہ نو دس فٹ پر پانی نکل آتا ہے۔ اس شادابی کا نتیجہ ہے کہ یہ علاقہ پورے ایران کے لئے غلہ فراہم کرتا ہے، انگور، کشمش اور خوبانیاں بکثرت ہوتی ہیں۔ ایسی ناسپائیاں میں نے سارے ایران میں کہیں نہیں دیکھیں۔ ترکاریاں بھی ہر قسم کی بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔

ایسا ہوتے ہوئے بھی آذربائیجان کی زراعت اور دیہی زندگی المناک نقشہ پیش کرتی ہو ذریعہ رسل و رسائل محدود اور مال کی آمد و رفت برائے نام ہے۔ ٹریکٹر کو یہاں کوئی جانتا ہی نہیں اور موٹر ٹھیلہ شاذ ہی دیکھا جاتا ہے۔ قصبہ خوش میں میں نے البتہ ملج پھٹکنے کی ملیں دیکھیں مگر وہ بھی روسی ساخت کی تھیں۔ باغوں میں درختوں کی کاٹ چھانٹ بہت کم ہوتی ہے۔ بہترین پھل کیڑے مکوڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دئے جاتے ہیں۔

پھل ہاتھوں سے نہیں توڑے جاتے بلکہ درخت کو ہلا کر گرا دئے جاتے ہیں جو زخمی ہو کر جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ اس علاقے میں فصل پانچ حصوں میں بانٹی جاتی ہے۔ ایک حصہ زمین کا، دوسرا پانی کا، تیسرا بیج کا، چوتھا بیل کا اور پانچواں کسان کا۔ جس کسان کے پاس اپنا بیل ہے وہ تو چالیس فیصدی پالیتا ہے ورنہ بیس فیصدی ہی پر قراعت کرنا پڑتی ہے۔ بیج اسے بالعموم زمیندار ہی سے لینا پڑتا ہے کیونکہ اپنا غلہ تو وہ کھا چکا ہے۔ الحاصل وہاں کی زراعت جہاں ہزار سال پہلے تھی وہیں آج بھی ہے اور اس نہایت زرخیز علاقے کا کسان بدستور افلاس زدہ ہے۔

حکومت ایران نے حکم جاری کر دیا ہے کہ خود مختار حکومت کے زمانے کا بقایا لگان وصول نہیں کیا جائیگا۔ مگر زمیندار جو اس زمانہ میں وہاں سے بھاگے ہوئے تھے اب واپس پہنچ کر وصول کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسان نے وہ لگان اس حکومت کو ادا کر دیا تھا۔

زمیندار کے ساتھ جندارمہ (پولس) بھی پھر نمودار ہو گئی۔ یہ دونوں کسان کے لئے وباد کا درجہ رکھتے ہیں۔ خود مختار حکومت قائم ہو جانے کی اہمیت کو زمیندار نے محسوس نہیں کیا تو جندارمہ کیا کرتی، جو زمیندار سے رشوت پا کر بقایا وصول کر رہی تھی۔ ایک امریکن ڈپلومیٹ موٹر سے آذربائیجان کا سفر کر رہا تھا۔ اسے ایک رات کسی کسان کے گھر ٹھہرنا پڑا۔ جہاں اُسے معلوم ہوا کہ چند روز پہلے ایک جندارمہ کا سپاہی اسی گھر میں ٹھہر چکا تھا اور غریب کسان نے حد سے زیادہ تواضع بھی کی تھی، لیکن چلتے وقت اس سپاہی نے دوسو ریال طلب کئے جو غریب کسان کے لئے بڑی دولت کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن سپاہی کے جبر و تشدد کے سامنے کسان کو یہ رقم ادا کرنا ہی پڑی۔ زمیندار و جندارمہ کی سختیوں سے کسانوں میں بے چینی ہے اور باغی جماعت اس بے چینی کو ہوا دے رہی ہے۔ ایک ایرانی مصنف نے مجھ سے کہا کہ:

”ہمارا ملک اس آدمی کی طرح ہے جو سونے کے تخت پر بیٹھا ہو مگر بھوکا ہو!“

بلاشبہ آذربائیجان کی حالت اس قول کی شرح و تفسیر ہے۔ جدید آلات سے کام لیا جائے تو یہ علاقہ فی الواقع سو نا اگلے۔ لیکن زمیندار ترقی کرنے کی خاطر روپیہ لگائے اور بغاوت ہو جائے تو اس کی دولت تو گئی، یہ خطرہ ہر وقت زمیندار کے سامنے ہے۔ اس لئے وہ تہران میں بیٹھا چین کر رہا ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکہ الآرامقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اسکا مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ منہجر نگار

چھٹا باب

(مرکز طوفان)

۱۹۴۷ء میں تہہ نیز، ایشیا کا مرکز طوفان تھا اور دنیا کی نظریں وہاں کے واقعات پر لگی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر لندن و واشنگٹن میں یہ خطرہ زیادہ محسوس کیا جا رہا تھا اور ماسکو میں امیدیں قائم ہو رہی تھیں۔ اس طوفان کے بادل اکٹھا ہونے میں وقت زیادہ لگا۔ یہ رضا شاہ ہی کے وقت سے اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے، کیونکہ رضا شاہ نے اصلاحات جاری کر لینے کے ساتھ آزادی کی خواہش کا بھی گلہ دیا۔ لیکن نئی سڑکوں کی تعمیر، ریلوے کا اجراء اور نئی فیکٹریاں قائم ہونا، ایک نئی سماجی طاقت کو وجود میں لانے والے اسباب تھے، یہ نئی سماجی طاقت ”مزدور“ کی ہے! ان تمام کاموں کے جاری ہونے سے مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ رضا شاہ مزدور تنظیم کا زبردست دشمن تھا، اسے لفظ WORKER سے چڑھ تھی۔ اس کے لئے اس نے LABOURER کا لفظ اختیار کیا۔ مزدور سنگٹھن، رضا شاہ کے استبداد کے لئے ایک چیلنج تھا اس لئے وہ اس تحریک کا دشمن تھا۔ رضا شاہ کو روٹس اور بالشوک تحریک سے بھی سخت نفرت تھی۔ شاید اس لئے کہ روٹس WORKER کے لفظ پر مصر اور اسے اعلیٰ صفات کا مجسمہ اور نوع انسان کا نجات دہندہ باور کرتا ہے۔

رضا شاہ کی یہ نفرت اس وقت اور شدید ہو گئی جب اسے گیلان کے بالشوک لیڈر مرزا کچک خاں سے واسطہ پڑا۔ آذربائیجان کی خود مختار حکومت کا سرخیل مرزا کچک تھا اور اس نے اپنی حکومت کے دنوں میں ”ورکر“ اور ”پرولتاریہ“ لفظوں کی زبردست اشاعت و تبلیغ کی تھی۔ لیکن بالآخر رضا شاہ مزدوروں کی بعض خفیہ جماعتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اس جبر و استبداد کا یہ نتیجہ نکلا کہ سوشلسٹ، کمیونسٹ اور تعلیم یافتہ طبقوں کے ساتھ مزدور اور لیبرل جماعتیں بھی متحد ہو گئیں اور ان سب کی ایک خفیہ جماعت بن گئی تاکہ رضا شاہی استبداد کا مقابلہ کیا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں اس جماعت

کے ترین ممبر پکڑ کر جیل میں ڈال دئے گئے اور کچھ دوسروں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس تحریک کے لیڈر تغلی ایرانی کو قصر قاجار جیل میں کوئی مہلک انجیکشن دیکر مار دیا گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں روسی اور برٹش فوجیں ایران میں داخل ہوئیں اور جب رضا شاہ معزول ہو کر جلاوطن ہوئے تو سارے سیاسی قیدی بھی رہا ہوئے۔ جعفر پشوازی دس سال سے جیل میں تھا، وہ بھی رہا ہوا۔ بعد میں اس نے آذربائیجانی بغاوت کی رہنمائی کی۔ پشوازی جرمنی اور فاشنرم کا زبردست مخالف ہے۔ رہائی کے بعد اس نے تودہ پارٹی قائم کی اور مردم اخبار بھی نکالا جو جرمنی کے طرفدار ایرانیوں کے خلاف لکھتا رہا۔ تودہ پارٹی میں ہر ایرانی ممبر ہو سکتا تھا مگر جو لوگ رضا شاہ کے ہوا خواہ رہے تھے ان کو ممبر نہیں بنایا جاتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اس پارٹی نے ٹریڈ یونین کی بنا ڈالی۔ ۱۹۴۷ء کے آخر تک پورے ایران میں مزدور

تحریک کا ایک مضبوط نظام قائم ہو گیا۔ جس کی رہنمائی ”فیڈریشن آف دی ٹریڈ یونین آف ایران“ کے ہاتھ میں تھی۔ ایران میں مزدوروں کی گنتی زیادہ نہیں مگر تودہ پارٹی کی سیادت میں تنظیم اتنی صحیح تھی کہ یہ تحریک ایک طاقت بن گئی۔ کارخانہ دار، زمیندار اور حکومت، سب ڈرنے لگے۔ اصفہان کی بلوں اور انیکلو ایرائن آیل کمپنی کی کامیاب ہڑتالوں سے پورا اندیشہ ہو گیا تھا کہ ایک روز ملک کی حکومت پر یہ جماعت قابض ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کے خلاف ہر قسم کی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ اس تحریک میں سارے کے سارے کمیونسٹ نہ تھے مگر انھیں کمیونسٹ کہہ کر اور روسی تحریک نام دیکر بدنام کیا گیا۔ آذربائیجان کی خود مختار حکومت میں صنعت و تجارت کا وزیر ایرج اسکندری ایک عالی خاندان شخص تھا، مگر تودہ پارٹی کا سخت دشمن بھی اسکندری پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ غدار ملک یا کسی بیرونی طاقت کا آدمی تھا، حالانکہ اسکندری آج جلاوطنی کی حالت میں یورپ میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ایک ممتاز قانون داں اور نہایت خوش بیان مقرر ہے۔ اس کے سیاسی عقاید سوشلزم کے ہیں۔ وہ زمین کی مساویانہ تقسیم فوراً کرنا چاہتا تھا مگر زمینداروں کو معاوضہ دیکر اسے اس بات کا یقین تھا کہ اگر کسان کو زمین کا مالک بنا دیا جائے اور اسے مشینی امداد دی جائے تو ایران ارتقائی اصول پر ترقی کر کے متمدن ملکوں کے دوش بدوش ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی یہ اسکیم جس میں نہ خون خرابے کا اندیشہ تھا، نہ ڈکٹیٹری کا اور نہ بیرونی طاقتوں کے نفوذ و اثر کا، انقلابی اسکیم کہہ کر دبا دی گئی۔

انتخاب میں پشوازی، مزدوروں کے ووٹ سے مجلس کا ممبر چنا گیا مگر جب مجلس نے اس کے انتخاب کو مسترد کر دیا، تو اس نے آذربائیجان جا کر ایک اور پارٹی ”ڈیا کرٹیک“ کے نام سے بنالی۔ اہل ایران کا خیال ہے کہ پشوازی ایسا نہ کرتا تو وہ پارٹی ایک طاقت بنی رہتی۔ ۱۹۴۷ء کے الیکشن میں تودہ پارٹی کو خاص کامیابی ہوئی اور کینیٹ میں اس کے تین ممبر لائے گئے تو بحران کی صورت پیدا ہو گئی۔ تعلیم، صحت اور صنعت و تجارت کی وزارتیں تودہ پارٹی

کے ہاتھ میں تھیں جن میں ایک اسکندری تھا۔

ایران کی تاریخ میں ”لیبرلا“ کا تخیل ہی بالکل نئی چیز تھا۔ تودہ کا نام لوگوں کے دلوں میں امنگ پیدا کر دیتا تھا اور لوگ اس خیال سے خوش تھے کہ ہزاروں برس کی پرانی شاہنشاہیت ختم ہو کر ترقی پسند جمہوریت قائم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ایرانی عوام کی تودہ تحریک نے جو بیداری اور حرکت پیدا کر دی تھی، اس کا اعتراف ہر حلقے میں کیا جاتا تھا۔ لیکن تبریز کے واقعہ نے اس تحریک کو نہ صرف آذربائیجان میں بلکہ پورے ایران میں ختم کر دیا۔ تبریز کی خود مختار حکومت کا بننا اور بگڑنا ایک اُلجھی ہوئی داستان ہے جو مورخوں کے منصفانہ فیصلے کی منتظر ہے۔

میں نے ایران کی سیاحت کی اور خصوصیت کے ساتھ آذربائیجان کی بناوت کے متعلق ہر قسم کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا، میں نے سفارت خانوں کے ریکارڈ بھی دیکھے اور غیر ملکی عینی شاہدوں کے بیان اور فیصلے بھی سنے، اور شہادت کے اس بڑے انبار میں سے ایک ہی بات چن سکا، وہ یہ کہ آذربائیجان کی بناوت و خود مختار حکومت کا قیام ایک زبردست اور حقیقی انقلاب کی ”ڈریس رہرسل“ تھی۔ تودہ تحریک ختم کر دی گئی ہے مگر اس کی مختصر تاریخ کے نمایاں واقعات ایرانی حکومت، روس، برطانیہ اور امریکہ کے مدبروں کے دماغوں پر سبوت کی طرح چڑھے رہیں گے۔

جعفر پشوازی اور اس کے ساتھیوں نے تبریز کی خود مختار حکومت کی طرف سے اعلان کیا تھا کہ آذربائیجان ایران سے الگ نہیں بلکہ ایک جمہوری نظام میں داخلی اختیار کے ساتھ ایران ہی کا جزو رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۷۸ء میں وہاں الیکشن ہوا، پارلیمنٹ چنی گئی۔ کیبنٹ بنی، پولس کا نظام قائم ہوا۔ قانون پاس ہوئے اور ٹیکسوں کی وصولی ہوئی۔ ایران سے تعلق ضرور رہا مگر برائے نام۔

اس خود مختار جمہوریت سے روس نے تعاون کیا اور امریکہ و برطانیہ نے اسے روسی حکمت عملی کہہ کر کوئی واسطہ نہ رکھا۔ طہرانی حکومت نے مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور وزیر اعظم غفام اور پشوازی کے درمیان طہران میں جو گفتگوئیں ہوئیں ان کی تفصیل تو کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ مصالحت کی یہ کوشش ناکام رہی۔ خیال یہ ہے کہ گفتگو ناکام رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ پشوازی کو اصرار تھا کہ آذربائیجان میں باغی فوج کے افسروں کو جو ترغیاں ملی ہیں وہ تسلیم کی جائیں مگر طہرانی حکومت اس بات کو باقی ایرانی فوج کے افسروں میں بے چینی پیدا ہو جانے کے خیال سے مان نہیں سکتی تھی۔ بالآخر ایک سال کی طیاری کے بعد طہران نے فوج کشی کر دی۔ مگر اس فوج کے پہنچنے سے تین دن پہلے تبریزی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایران کے لوگوں کا خیال ہے کہ پشوازی بہت سا روپیہ اور سامان لیکر روس چلا گیا ہے جو صرف اسی میل پر ہے، لیکن پشوازی

کے دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ آذربائیجان ہی میں ہے۔

میں نے اپنی سیاحت کے دوران میں اندازہ کیا کہ تبریز میں بے چینی سطح پر بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ فوجی پہرہ بھی معمولی سا ہی رہتا ہے، لیکن میں اس خیال کو دماغ سے دور نہیں کر سکا کہ انقلاب کے مخالفوں کے باوجود، جمہوری حکومت نے ایک سال کی قلیل مدت میں جس قدر اصلاحات جاری کر دیں، اس شہر کے لوگوں نے ان باتوں کو شاید کبھی جانا بھی نہ سنا تھا۔ ان تمام خرابیوں کے ہوتے ہوئے جو اس کم عمر جمہوری حکومت سے منسوب کی جاتی ہیں، اس نے شہر میں چار میل سڑک کو لتار سے بنوائی، گداگر اور پیشہ و غریب شہر سے غائب ہو گئیں، ایک زچاؤں کا اسپتال قائم کیا، ایک یونیورسٹی قائم کی جس میں دوسرے شعبوں کے علاوہ میڈیسن، زراعت کے شعبے بھی ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن بنایا، پولس کا انتظام ایسا تھا کہ عورتیں اندھیرے میں بھی بلا خوف آجا سکتی تھیں، قانون آراضی میں بھی اصلاح شروع کر دی تھی، طہران کا ”لیبرلا“ معطل پڑا تھا اسے پوری طرح نافذ کیا، افیون کی تجارت یک قلم ختم کر دی۔ حکومت کے دفاتروں میں فالتو اور نیکے اسٹاف کی تحفیف کر کے کام اور قانون کا اجراء آسان کر دیا۔

ایسے کارناموں کے بعد بھی یہ نظام منتشر ہو گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکومت نے اپنی فوجی طاقت نہیں بنائی جو طہرانی فوج سے مقابلہ کر سکتی۔ حالانکہ طہرانی فوج اپنی شاندار وردی کے علاوہ کسی امتیاز کی مالک نہیں ہے، پھر آذربائیجانی اسی نسل سے ہیں جس سے کاشغری ہیں۔ اس جمہوری نظام کو عوام کی پوری ہمدردی حاصل نہیں ہوئی اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس خود مختار حکومت نے جب کسان سے زمینداری لگان وصول کیا تو وہ سمجھا کہ یہ حکومت پُرانے زمیندار ہی کی قائم مقام ہے۔ اس نے زمیندار کے کارندے اور حکومت کے تحصیلدار میں فرق نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے وعدہ تو تھا کہ زمین اس کی ہو جائے گی۔ دوسری وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نظام نے اپنے اوپر سے اس الزام کو ہٹانے کی کوشش مطلق نہیں کی۔ زار کے زمانہ ہی سے ایرانیوں کو روس کے نام سے بیزاری ہے، اور طہرانی حکومت کے خفیہ ایجنٹوں نے عوام میں روس کو زیادہ غیر مقبول بنادیا تھا، جمہوری حکومت نے یہ کوشش ضروری کہ آذربائیجانی عوام میں قوم پرستی کا جذبہ شدید ہو جائے۔ اور اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاتی تو یقیناً طہرانی حکومت کا پروگنڈا ناکام رہتا مگر قوم پرستی کا جذبہ ابھارنے کو زیادہ وقت زیادہ کوشش درکار تھی۔

میری سیاحت کے دنوں میں تبریز خاموش تھا، زندہ دلی کے آثار مفقود تھے۔ اقتصادی بد حالی شدید تھی۔ دن بھر کی مزدوری چھ تومان تھی، حالانکہ گدھے کا کرایہ دن بھر کے لئے سات تومان ہوتا ہے

کا رو ہاں سرد تھا کیونکہ سرمایہ دار کو ڈر تھا کہ روس صرف اسٹی میل پر ہے۔

میری سیاحت کے دنوں میں آذربائیجان کا ایرانی گورنر جنرل علی منصور تھا جو ایک وقت ایران کا وزیر اعظم بھی رہ چکا تھا اور مانا ہوا مدبر سلطنت تھا۔ علی منصور کو پوری امید تھی کہ امریکہ نے روپیہ کی مدد دی تو حکومت کا ہفت سالہ پلان کامیاب ہو کر حالات کو بدل دے گا۔

تبریز کی خود مختار حکومت کے ختم ہوجانے سے ایرانیوں میں قومی جذبہ اُبھر آیا تھا۔ شاہ نے آذربائیجان کا سفر کیا اور نہایت پر جوش خیر مقدم ہوا۔ طہران کے غیر ملکی سفارت خانوں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ گویا مغربی طاقتوں نے روس پر فتح حاصل کی تھی!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اطمینان عارضی ہے، سوویت کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ جن اسباب نے پہلا انقلاب کرایا ان کی جڑ زمین کے اندر ہے اور وہ اب بھی جیسے کے تیسے موجود ہیں۔ باغی جماعت متحرک ہے یہاں میں ان کے تین ریڈیو اسٹیشن روزانہ پروگرامنگ کر رہے ہیں۔ اور حکومت تہران صرف امریکہ کا آسرا تک رہی ہے۔ لیکن امریکہ کی امداد گولے برساکر آبادیاں تو تباہ و مسمار کر سکتی ہے، بھوکوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ ایرانی عوام کے لئے روٹی چھپا کر ناقہ تہرانی حکومت ہی کا کام ہو اور وہی کر بھی سکتی ہے۔

حسن کی عیاریاں

اور

دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی

اور

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اسے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

ساتواں باب

(تشنہ جواب)

شمالی صوبہ ماژندراں کے شہر رسار میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ایران میں نہیں ہوں۔ یہاں ایرانی تہذیب و تمدن جسے میں اپنی سیاحت کے دوران میں سرِ لحظہ دیکھتا رہا ہوں۔ مفقود تھا، نہ وہ مشرقی مناظر تھے اور نہ اس کی صدا ئیں۔

ایرانی دوستوں نے اس علاقے کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔ مگر جب میں رسار پہنچا تو ایسا معلوم ہوا کہ ایران کے کسی شہر میں نہیں بلکہ قبل از جنگ کے کسی مغربی شہر میں پہنچ گیا ہوں یا امریکہ کا کوئی شہر اٹھاکر یہاں بسا دیا گیا ہے۔

بلندی پر ایک ہوٹل کی شاندار سفید عمارت کے دروازوں کے چمکتے ہوئے شیشے، وسیع اور ہوادار برآمدہ، کشادہ چکر دار زینہ، لمبے چوڑے صحن میں خوش قطع چمن زار کی نیرنگی، نسرین و نسرین کے نظر فریب تختے، قسم قسم کے بلند درخت، الغرض ہر چیز ستھرے پن کی زندہ شہادت تھی۔ بیرونی شان اور دلکشی سے زیادہ آرائش ہوٹل کے اندر تھی۔ ایران بھر میں صرف یہیں پانی کی بہم رسانی کا انتظام تھا جو صاف شفاف پہاڑی چشموں سے تلوں کے ذریعہ پہنچتا تھا۔ پورے ہوٹل میں کمران و کاشان کے قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ اس سے بہتر ہوٹل تصور میں نہیں آ سکتا۔

یہ ہوٹل سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے بالکل دامن میں بنا ہے۔ ان پہاڑیوں پر گھنا جنگل ہے جہاں ہمہ قسم کے جانور اور پرند ملتے ہیں۔ دوسری طرف سمندر کی ساکن سطح کو سورج کی روشنی نے آئینہ بنا رکھا تھا پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں پر بادلوں کا گھرارہنا ایک پُر لطف منظر پیش کرتا تھا۔ غرض ہوٹل کے تمام جدید ترین سامان عشرت کے ساتھ سامنے قدیم زمانہ کا یہ جنگل ایسا نظارہ تھا کہ ایران تو کیا غالباً سارے ایشیاء میں میسر نہ ہوگا۔

صرف سترہ سال پہلے رمسار کے مکانوں کا ایک گاؤں تھا۔ رضا شاہ نے اس گاؤں کو دلکش تفریح گاہ بنا کر شہر آباد کر دیا۔ اس شہر کی تعمیر پر کتنی دولت خرچ ہوئی کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ یہ رضا شاہ کی جیب خاص سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی طرح یہ بھی پتہ نہیں لگ سکتا کہ اس کی تعمیر کے زمانہ میں مزدوروں کی کتنی تعداد ملیر یا اور دوسری دباؤں کا شکار ہوئی۔

لیکن وہ لوگ بھی جو رضا شاہ سے کسی نہ کسی بنا پر خفا ہیں، اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رمسار سا حسین شہر محض رضا شاہ کی کوشش کا نتیجہ ہو سکتا تھا، کسی دوسرے کی بس کی بات نہ تھی۔

رمسار میں میری ملاقات ایک ایرانی سائنسدان سے ہوئی جو فرانس کا تعلیم یافتہ تھا، کہنے لگا:-

”ہمارے ملک میں دولت کی کمی نہیں، ہم فرانس سے زیادہ متمول ہیں، ہمارے

زرعی وسیلے جرمنی سے زیادہ ہیں، لیکن رضا شاہ کی معزولی کے وقت سے ہم

بے حس و حرکت کھڑے ہیں، کچھ کر نہیں رہے!“

یہ شکایت بجا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ایرانی سرمایہ دار اپنی دولت کو دبائے بیٹھے ہیں۔ میرے خیال میں

ایرانی سرمایہ دار دنیا بھر میں سب سے زیادہ خسیں اور بہت زیادہ زیرک ہے۔ اس کا ثبوت اصفہان میں کپڑے کی کامیاب صنعت سے ملجاتا ہے۔

رضا شاہ نے خود اصفہان آکر وہاں کے دو لہجہ والوں کو بلایا اور ایک تقریر میں بتایا کہ اس زمانے میں

مشین سے کام نہ لیکر ہاتھوں ہی سے کام لینا حماقت ہے۔ تم لوگوں کو اصفہان میں کپڑے کی ملیں قائم کرنا چاہئے لوگ چپ رہے۔ وہ سمجھ نہ سکے کہ شاہ انھیں مشورہ دے رہا ہے یا یہ فرمان شاہی ہے۔ مشورہ کو ٹوٹا جاسکتا

تھا مگر فرمان کی تعمیل لازمی تھی! دوسرے دن گورنر نے ان لوگوں کو پھر بلا کر شاہ کی مرضی بتائی۔ تب لوگ

مجبور ہو گئے اور ملیں قائم ہو گئیں جن سے بہت نفع ہو رہا ہے اور اصفہان، ایران کا مینیسٹر بن گیا ہے۔ لیکن

باوجود اس کے کہ مالک بے حد منافع اٹھا رہے ہیں۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ قلیل رقم کے صرف سے ایک

ماہر انجینیر یورپ سے بلا کر رکھیں تاکہ وہ ان کی مشینوں کو بہترین حالت میں رکھ سکے اور یہ لوگ برٹش اور اطالی

کے کپڑے کی قیمتوں کا مقابلہ کر سکیں۔

شکستہ کے موسم خزاں میں مجلس نے ایک سو دو ووٹ سے بمقابلہ دو ووٹ کے روس کے اس مطالبہ

کو مسترد کر دیا کہ اسے شمالی ایران میں تیل نکالنے کے مراعات دئے جائیں۔ ایران میں تعلیم یافتہ طبقہ ہی پبلک

اسپرٹ رکھتا ہے اور سیاسی معاملات کو دیکھتا سمجھتا ہے۔ ایران کی پبلک رائے کے معنی اسی طبقہ کی رائے

ہے۔ اس طبقے میں جن لوگوں کے دلوں میں تو وہ تحریک کی یاد باقی تھی اور اس تحریک کے ختم ہو جانے پر

جن کو لال تھا، وہ لوگ اس فیصلے سے رنجیدہ ہوئے۔ لیکن دوسرے گروہ نے اسے ایک قومی فتح مندی سمجھا، انھیں یقین تھا کہ روس کے انکار کر دینے کے بعد ایرانی سرمایہ دار تیل کی صنعت میں فراخ دلی سے سرمایہ لگائیں گے جو نفع بخش ہونے کے علاوہ سلافی ہمسایہ کے ساتھ وجہ مخالفت کو بھی دور کر دیگا۔

لیکن ایران کا سرمایہ دار آج تک خواب گراں میں محو ہے، اور ایرانی تعلیم یافتہ طبقے کے دو ٹوٹ گروہ ڈائیں اور بائیں بازو والے، حیران ہیں کہ قوم ملک کا حشر کیا ہونا ہے! کیونکہ وہ خوب واقف ہیں کہ روسی سرحد پر امریکن سرمایہ دار ایک ڈالر لگانے کو طیارہ ہوگا اور نہ دوسرا کوئی ملک اس مخدوش کام میں ہاتھ ڈالے گا۔ جو قوم شمالی ایران میں نکالنے آئے گی، روس سمجھے گا کہ اس کے علاقہ سرکیشیا کے تیل کو ہتھ پانے کی سازش ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ روس سے جھگڑا کون مول لے؟

ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس مشینی زمانے میں جبکہ نہ صرف صنعت بلکہ زراعت اور فوجی ساز و سامان کے لئے بھی سپرول کی ضرورت ہے، ایرانی تیل زمین کے اندر دبا پڑا نہیں رہنا چاہئے۔ ایک اعلان ہوا تھا کہ شمالی ایران کا تیل خود ایران نکالے گا۔ مگر سیاسی تذبذب کی صورت میں جو اس وقت ایران پر چھایا ہوا ہے، لوگوں کو بھروسہ نہیں کہ ایران ایسا کر سکے گا۔

ایرانی تاجر اس میں شک نہیں کہ زیر کی ودانائی میں تمام دنیا کے تاجروں سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہو لیکن وہ معمار نہیں ہے، اس کا صنعتی مزاج نہیں ہے، اس لئے جس بات کا نتیجہ بہت عرصے بعد نکلے اس میں اسے دلکشی نظر نہیں آتی۔ ایرانی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے خوب کہا کہ ”ایرانی تاجر شخص صراف ہے، وہ خرید و فروخت کر کے فوری نفع حاصل کرنا جانتا ہے، اس لئے اس کے اندر یورپ کے تاجروں کی سی وہ اسپرٹ نہیں ہے جو انھیں خطرہ کا مقابلہ کرنے پر طیار کر دیتی ہے۔“

ایرانی تاجر کی یہ فطرت حکومت ایران کو اس طرف لئے جا رہی ہے کہ خود حکومت تمام تجارت کی اجازت دیا بن جائے۔ حالانکہ امریکہ کا تاجر حکومت کے ایسے اقدام کو کبھی گوارا نہ کرے گا۔

ایرانیوں کے اس مخصوص کردار کا ایک خاص سبب ہے، غیر ملکیوں کے حملے، مسلسل سازشیں، ہر وقت کی دھمکیاں اور لوٹ کھسوٹ، اسی کے ساتھ ملکی حکمرانوں کا جبر و استبداد، یہ تمام باتیں ہیں جن کی وجہ سے ایک ایرانی کو اپنے ملک و قوم پر بھروسہ نہیں رہا۔ کم از کم ایرانی تاجر تو ان دلیالی سے اپنی معذوری ثابت کر دیتا ہے۔ لیکن یورپین یا امریکن کی نظر میں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اہل مشرق صبر و قناعت کے عادی ہیں اور راحت و سکون کی تلاش ان کی فطرت ہے اور ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی جو ان روایات پر ایک کاری ضرب لگاتی، ایران میں نہ کوئی سماجی انقلاب ہوا نہ ذہنی! البتہ رضا شاہ نے ایرانی تاریخ کو

ایک دھکا دیا تھا، لیکن اس کا کام کرنے کا ڈھنگ ایسا نہیں تھا جو ایرانی تاجر کو تعمیری کاموں کے لئے اُسجار سکتا بلکہ وہ بھوچک اور مایوس زیادہ ہو گیا۔

ایران، غیر ملکوں خاص کر امریکہ سے قرضہ ملنے کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ اور بلاشبہ ایسا قرضہ مل جانے سے ایران ترقی کر بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر ایرانی زمیندار عقل سے کام لیتا اور مستعدی دکھاتا تو یقیناً ایرانی کاشتکار کا مقدار اس قرضے کے بغیر بھی بدلا جاسکتا تھا۔

ایران کی وزارت زراعت نے امریکن ماہر ڈاکٹر لایل ہیڈن کو بلا کر ایک زر خیز علاقے میں پانچ گاؤں پر تجربہ کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس ماہر نے بغیر کسی نہی اصلاح کا قانون جاری کر کے نہایت قلیل صرف پر بہت زیادہ کامیابی حاصل کر کے دکھا دی۔ میں نے مزان کے گاؤں کو خود جا کر دیکھا، جہاں ڈاکٹر لایل نے تجربہ کیا تھا۔ ایرانی دہقان نے مکھی، مکڑی، جوں، بچھو اور دوسرے حشرات الارض کو ایک اٹل تقدیر کی طرح مان لیا تھا، لیکن ان پانچوں گاؤں میں آج کسی قسم کا کیڑا مکوڑا نہیں ہے۔ پورے ایران میں یہی ایک گاؤں میں نے ایسا دیکھا جہاں کے آدمی بدن نہیں کھجاتے تھے۔ کوئی خارشتی کتا بھی نظر نہیں آیا، اس کامیابی کے لئے ڈاکٹر ہیڈن نے فی گھر پونے دو ڈالر خرچ کئے، جس میں ایک تہائی سرکاری خزانے میں کسٹم ڈیوٹی کی صورت میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر ہیڈن نے حکومت ایران کو بتا دیا کہ اگر تین سال تک پانچ ڈالر فی کنبہ کے حساب سے خرچ کیا جائے تو پورا ایران جملہ و باؤں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس اسکیم پر باتیں بہت کی گئیں مگر ہنوز روز اول ہے۔ اس کا سبب متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے بہت معقول بات کہی کہ:-

” ہماری ملک میں لوگ صرف زمینداری اور تجارت ہی سے روپیہ نہیں کماتے، بلکہ سیاست

کو بھی نفع بخش بنا لیتے ہیں۔“

ایک ممتاز وکیل نے اعتراف کیا کہ لوگ دو دو کھاتے رکھ کر انکم ٹیکس کی چوری کرتے ہیں۔ ایران میں امریکہ کا فوجی مشن فوجی حالت سدھارنے کا کام کر رہا ہے۔ اس مشن نے چھ جرنیلوں کی برطرفی تجویز کی کیونکہ وہ رشوت کے خوگر بن گئے تھے۔ ایران کے فوجی افسر بالعموم غریبی یا معمولی حالت میں داخل ہوتے ہیں اور امیر بن کر سبکدوش ہوتے ہیں۔ بے اعتباری کی حد یہ ہے کہ ایرانی تاجر فوج کی سپلائی، ماہوار بل کے اصول پر نہیں کرتے بلکہ بازاروں کی طرح اسی وقت قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ دنیا کے ملکوں میں ایران ہی ایسا ملک ہے جس نے اندرون ملک کوئی قرضہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت پر ایرانی پبلک ورکسکر دولت مند طبقہ کو بھروسہ نہیں ہے۔

ایرانی تاجر کی زیر کی دہشمنندی کا سب سے بڑا ثبوت ایران کے نیشنل بینک کے ریکارڈ سے ملتا ہے، جسے بریٹنجر جرنل امیر خسروی نے قایم کیا تھا۔ یہ رضا شاہ کا مقرب خاص تھا۔ اس بینک کی بناء ڈالتے وقت یہ بات بنیادی طور پر مان لی گئی تھی کہ ایران بالطبع بددیانت نہیں ہے چنانچہ ملازموں کو اتنی کافی تنخواہیں دیکھتی ہیں کہ انھیں چوری یا رشوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ امیر خسروی کا یہ اصول بہت کامیاب رہا۔ اس وقت اس بینک کا گورنر ابوالحسن ابتہاج ہے اور اس کی قابلیت مسلمہ ہے۔ اس کے دشمنوں نے متعدد سیاسی الجھنوں میں پھنسا کر اسے ذلیل و رسوا کرنا چاہا مگر اس کی سادھ کو صدمہ نہ پہونچا سکے۔

یہ بینک اپنے چار ہزار ملازموں کو معقول تنخواہوں کے علاوہ اور بھی خاص رعایتیں دیتا ہے۔ مثلاً انھیں خاص چھٹیاں بھی لینے کا حق دیا گیا ہے، ان کی صحت کا بیمہ کرتا ہے، ملازموں کی لڑکیوں کی شادی پر بینک کی طرف سے جہیز کے لئے ایک رقم دی جاتی ہے، ان کو سامان غذا سستی قیمت پر اور کم تنخواہ والوں کو بازار سے نصف قیمت پر دیا جاتا ہے، ملازموں کی بیویاں حاملہ ہوں تو زچگی کا خرچ دیا جاتا ہے غرض ابتہاج نے اپنے ادارے کو بددیانتی سے پاک رکھنے کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور وہ اس میں کامیاب ہے۔ ایک ملاقات میں ابتہاج نے مجھ سے کہا کہ:-

”اگر اسٹیٹ بینک کے چار ہزار ملازم کامل دیانت اور وفاداری کے ساتھ کام کر سکتے ہیں تو

چار لاکھ کو بھی ایسا بنایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ انھیں خدمت کا معاوضہ اتنا دیا جائے کہ وہ

لاچے کا شکار نہ بن سکیں۔“

میں نے اکثر لوگوں سے یہ بات سنی کہ: ”ایران میں سو ابتہاج ہوتے تو ایران کی سر زمین جنت کو شرا دیتی۔“ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ایک انجینئرنگ فرم کے دو انجینروں نے ایران کے اقتصاد پر آٹھ سو صفحے کی رپورٹ طیار کر کے اپنے فرم کو بھیجی تھی (تاکہ امریکن حکومت کو اعلیٰ عمال کے صحیح اعداد و شمار اور اصل واقعات و صورت حال کی پوری اطلاع پہونچ جائے) اس رپورٹ کی بناء یہ تھی کہ ایران کو قرضہ دیا جائے اور وہ قرضہ خود بخود ادا ہو جائے۔ اس کتاب میں اس رپورٹ پر تبصرہ تو کیا نہیں جاسکتا لیکن مجھ جیسے نادان کا کار آدمی کی نظر میں اس رپورٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایرانی زراعت کو درختوں کی بیماریوں سے جو بڑا نقصان ہوتا ہے، اس کے دفع کرنے کی بڑی موثر تدبیر بتائی ہے، کیڑے کوڑوں کی بدولت اناج کی پیداوار میں ایران کو تین کروڑ ڈالر کا سالانہ نقصان ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر رپورٹ کی ہدایات پر عمل کیا جائے تو ایران کو ڈھائی کروڑ سالانہ کی بچت ہو سکتی ہے۔

ایران، دنیا میں سب سے زیادہ چائے پینے والا ملک ہے، لیکن سماردار چائے اور استخنان

(کاسخ کا چھوٹا گلاس) یہ تینوں لفظ روسی ہیں۔ ایران، خود بھی چار ہزار ٹن چائے پیدا کرتا ہے، لیکن ایک کمزور ڈالر کی چائے باہر سے آتی ہے۔ حالانکہ بحر قزوین کے علاقے میں ہیں ہزار ایکڑ زمین ایسی پڑی ہے جہاں چائے کی کاشت بڑھا کر ایران غیر ملکی چائے سے بے نیاز ہو سکتا ہے لاکھوں ڈالر بچا سکتا ہے۔ اسی طرح وہاں زمین کی پیداواری طاقت کو بھی دوگنا کیا جا سکتا ہے۔

وزیر اعظم غفام نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ بہت بڑے علاقے کو قابل کاشت بنا کر زمین کسانوں کو مفت دی جا سکتی ہے۔ دس پندرہ سال ان سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا، مگر اس کے لئے بیرونی قرضے کی ضرورت ہے۔ یہ ایرانی حکومت کا طریق کار ہے، ورنہ بہت سا کام بغیر بیرونی قرضے کے بھی انجام پاسکتا ہے۔

سرزمین ایران غیر معمولی طور پر حسین بھی ہے اور زرخیز بھی، لیکن ایسا ملک اور یہ قوم، دیکھئے تو سر سے لیکر پاؤں تک، زخم ہی زخم ہے!

تاریخ کے ایک دور میں ایران دنیا کی زبردست طاقت رہ چکا ہے۔ میں نے ایک ایرانی میوزیم میں ڈھائی ہزار سال پرانا فولادی ہل دیکھا۔ یہ ہل ان تمام ہلوں سے بہت زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہے جو اس وقت ایرانی کاشتکار استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کو توجہ نہیں۔ اس لئے آخر میں یہ سوال سامنے آ جاتا ہے کہ نجات کی صورت کون سی ہے؟ میرے خیال میں ایران کو ایک مضبوط ہاتھ کی ضرورت ہے! پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ رضا شاہ ایسے آدمی کا ہاتھ ہو، یا دارا اور شاہ عباس جیسے مصلحوں کا؟ آیا وہ ہاتھ ایرانی سرزمین سے اٹھنے والے انقلاب میں ملے گا یا روس کی ڈکٹیٹری کی صورت میں نمودار ہوگا؟ یا پھر واشنگٹن و لندن کی مالی امداد ہی نجات کی صورت پیدا کرے گی؟

ایک غیر ملکی مقیم ایران نے مجھ سے کہا کہ:-

”ایک بلین (سولین) ڈالر کا قرضہ اور ایک سو یورپین یا امریکن ماہرو انجینئرس سال

میں ایران کی صورت بدل دے سکتے ہیں!“

بہر حال دو باتیں اٹل ہیں: اس شینی عہد کی ترقیوں کے زمانہ میں ایران کا جمود عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا، اور ترقی و خوشحالی کے لئے جو پروگرام بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا زمین اور کاشت کی اصلاح ہی سے ہوگی۔

آٹھواں باب

(قاہرہ)

جنگ کے زمانہ کا قاہرہ کچھ اور تھا، اور شہر کا کچھ اور اب وہ بالکل پہلے کا سا قاہرہ ہو گیا تھا وہی کاہلی، وہی چیخ کربات کرنا وہی عمامہ پوش Dyagoman وہی گداگروں کی کثرت اور وہی خواجہ فروشوں کی بھرمار۔ ایام جنگ کی خوشحالی مفقود تھی۔

بڑے بڑے ہوٹل آدھے خالی پڑے تھے، اور ان ہوٹلوں کے بار روم اسپتال کی طرح خاموش تھے۔ بڑے بڑے بازاروں کے دوکاندار گاہکوں کی کثرت سے بوکھلائے ہوئے نہ تھے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ سونا بٹورنے کا زمانہ ہوا ہو چکا تھا۔

بائیں ہمہ، یورپ سے اڑ کر قاہرہ پہنچے جانا ایک عجیب اور حرکت میں لے آنے والا تجربہ تھا، معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کی بندی سے کسی نئے براعظم پر نہیں بلکہ کسی نئے گروے پر ٹپکا دئے گئے ہیں۔ جہاں کی آب و ہوائ نئی، تہذیب نئی اور لوگ مختلف ہیں۔ بازاروں میں مال و اسباب کی کثرت حیران کر دینے والی تھی۔ یورپ کو چھوڑے، سوئٹزر لینڈ میں نہ تو ڈالر کی حکمرانی تھی اور نہ ڈالروں ہاں ہیر و کا درجہ رکھتا تھا اسلئے سوئٹزر لینڈ کی ٹرین ”ڈی لکس“ کے مسافروں کو بھی قہود میں سیکرین ملتی تھی۔ لیکن قاہرہ میں ڈالر کا قحط ہونے کے باوجود شکریہ کیا معنی کسی چیز کی کمی تھی ہی نہیں، وہاں نہ کسی چیز کا راشن تھا اور نہ کوئی شے ایسی کہ قابل حصول نہ ہو۔ قاہرہ میں لوگ چیزیں ڈھونڈتے نہیں پھرتے تھے بلکہ خود سامان خریداروں کا منتظر رہتا تھا۔ یورپ کی فاقہ کشی کے بعد قاہرہ میں کھجور اور انجیروں کے انبار کیلے امرود کے ڈھیر، آموں کی افراط دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

مصر میں جنگ نے کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا یا نہ تھا۔ عیش و آرام کے اسباب مغربی ملکوں میں ناپید ہو گئے تھے مگر مصر میں کثرت سے ملتے تھے۔ مصر کی راجدھانی ایک ایسا شہر تھا جہاں کسی کو قیام گاہ کی

جستجو میں سرگراں نہیں ہونا پڑتا تھا۔ زیورچ اور جینیوا میں ڈالر کی بڑی ارزانی تھی مگر وہاں سیاحوں کو قیام و طعام اور نغمہ و شراب اس آسانی سے میسر نہیں ہو سکتے تھے جس طرح قاہرہ میں، شبینہ کلب، قصبہ کلیں سے خانے اور سینما، نہایت خندہ پیشانی سے سیاحوں کا خیر مقدم کرنے کو ہمہ وقت طیار تھے۔ ہر قسم کی عیاشی و سترس کے اندر تھی اور اس کے ہمایا کرنے والے موٹر پر سیاحوں کا پیچھا کرنے کو موجود تھے۔

بیروزگاری شدید ہونے کے باوجود قاہرہ کے بازاروں میں ہر قسم کے سامان کی کثرت دیکھ کر یورپ سے آنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ متعجب کرنے والی چیز یہاں کا تضاد ہے۔ ایک طرف قدیم اہرام اور عالیشان مسجدوں کے پرانے گنبد و مینار اور دوسری طرف جدید وضع کی شاندار ودلکش عمارتیں اور پھر اسی کے ساتھ کچی جھونپڑیاں بھی لوق و دوق صحرا کے بالکل کنارے ایسے باغ نظر آتے ہیں جو دنیا کے کسی شہر میں نظر نہیں آ سکتے۔

میش قیمت اور شاندار امریکن موٹریں دوڑتی پھر رہی ہیں اور اُسی کے ساتھ اونٹوں اور گدھوں کے قافلے بھی ہٹو بچو کہتے گزر رہے ہیں۔ مصری لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خوش باش اور خرچیلے ہیں اور یورپ کا تازہ ترین فیشن قاہرہ کی سڑکوں پر عام طور پر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مصری قوم اتنی ہی خلیق و باتمیز ہے جتنی دنیا کی کوئی قوم ہو سکتی ہے مگر افلاس اور غریبی بھی اس ملک میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

ایران کی طرح قاہرہ میں بھی عورتیں نقاب پوش رہتی ہیں۔ لیکن وہ مصری لڑکیاں جو نقاب نہیں ڈالتیں اور سرخی و غارہ، بوڈو وغیرہ کمال صناعی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں، دنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہو سکتی ہیں۔ قاہرہ میں مرد عورت بالعموم آدھی درجن زبانیں بلا تکلف بول سکتے ہیں۔ مگر دوسری طرف بے شمار مصری اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے۔ اس شہر میں نمائش بے حد اور سنجیدگی کم ہے۔ فوری طور پر وہاں بڑے سے بڑا واقعہ رونما ہو سکتا ہے مگر استحکام و استقلال کم باتوں میں ہوتا ہے۔ وہاں اگر سنجیدگی و ہم آہنگی دیکھی جاسکتی ہے تو اس کے ساتھ شور بھی ایسا ہے جو کانوں کے پردے بھاڑ دے، اگر وہاں کے مرد بالعموم بلند آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہیں تو وہاں کی عورتیں نرم کلامی کی عادی ہیں، اگر وہاں خونچے والے بدمیز و گستاخ ہیں تو اسی کے ساتھ بڑے دوکاندار و درجہ مہذب و شایستہ ہیں۔

قاہرہ کی ٹیکسیاں یورپ کے اکثر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ چکیلی اور شاندار ہیں۔ امریکن بسیں جس کثرت سے قاہرہ میں چلتی ہیں زیورچ میں بھی نہیں دیکھی تھیں حالانکہ زیورچ ہی ایک ایسا شہر ہے

جہاں ڈالر بکثرت اور ارزاں ہے۔

اسکندریہ کے شیپرڈ ہوٹل سے پانچ منٹ چلے تو آپ کو دنیا کی حقیر ترین بستیاں اور جھونپڑیاں دکھلائی پڑیں گی جہاں کی گندگی اور بودماغ پریشان کر دے گی۔ جہاں بچوں کی اکثریت آنکھوں کی بیماری میں مبتلا نظر آئے گی۔ گداگر فٹ پاتھ پر لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آئیں گے۔ مصر کی اوسط اموات ساری دنیا سے زیادہ ہے۔ ایک سال کے ہر چار بچوں میں سے ایک مر جاتا ہے۔

الغرض قاہرہ، تضاد و تخالف کا مرکز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ۵۲۵ء قبل مسیح پڑی تھی۔ اس کی آبادی ۱۹۰۰ء میں ساڑھے چھ لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی اور آج بیس لاکھ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ غیر ملکی سیاح جب مصر کی راجدھانی میں پہنچتا ہے تو لب صحرا ایک عالیشان شہر بسا دینے والی قوت و ذہانت پر عیش عیش کرنے لگتا ہے۔ مشرق اگر اپنی خوبیوں اور خرابیوں کو انتہائی صورت میں کسی جگہ پیش کر سکتا ہے تو وہ جگہ قاہرہ ہے۔ افریقہ بھر میں سب سے بڑا اور ہنگامہ آفریں شہر ہونے کے ساتھ ہی قاہرہ ہزار مسجدوں والا شہر بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ایک ہزار سال کی قدیم یونیورسٹی ”ازہر“ قائم ہے۔ اس جامعہ میں تیرہ ہزار لڑکے تعلیم پاتے ہیں، جن میں چھ ہزار دیگر ممالک کے ہیں۔ ایک مصری عالم کے لفظوں میں ”قاہرہ اسلامی دنیا کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔“

قاہرہ میں ایک جماعت ”اخوت اسلام“ کے نام سے قائم ہے جو ہر جماعت اور نئی تحریک کی دشمن ہے۔ اگر سیکلچر کالج کے طلبہ و طالبات اور پروفیسروں نے ایک محفل رقص و سرود جمائی جس میں ”ایوننگ ڈریس“ ضروری تھا، اس محفل میں بادۂ ارغواں کے دور بے تکلف چلے۔ ”اخوت“ والوں نے اس کو نجس اور گندہ کا لقب دیا۔

میرے قیام قاہرہ کے دوران میں ”اخوت“ والوں نے ایک ادیب کی گرفتاری کا مطالبہ کیا کیونکہ اس نے اپنے کسی مضمون میں اس بات کا مذاق اڑایا تھا کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو جانے پہچانے بغیر شوہر اور بیوی بن جاتے ہیں۔ ”اخوت“ کے ایک اخبار نے ان اخباروں کی اشاعت روک دینے کا بھی مطالبہ کیا جو لباس غسل میں لڑکے لڑکیوں کی تصویریں شائع کرتے ہیں۔

قاہرہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے مجھے ایک شام بدیعہ میں مدعو کیا۔ بدیعہ ایک نہایت فیشن ایبل اور مشہور ریڈیو ران ہے جہاں الازہر اور اخوت کی طاقت و اثر کے باوجود نوجوان لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں۔ اس مجلس میں شریک ہونے سے پہلے میں تصور میں نہ لاسکتا تھا کہ مسلم تاشائی ایسے منظر کو گوارا کر سکتے ہیں، خاص کر جس شہر میں جامعہ الازہر قائم ہو!

میں نے اپنے میزبان دوست سے سوال کیا کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع میں اسلامی تعلیم کی یہ پامالی کیونکر ممکن ہے تو اس نے کہا کہ ”یہ قاہرہ ہے!“

مصری پایہ تخت میں کسی مذہب کی تعلیم کا کوئی اثر نہیں ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ:-

”قاہرہ ساری دنیا کے شہروں میں سب سے زیادہ کھل کھیلنے والا شہر ہے۔“

مصریوں کی متضاد طبیعت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک طرف مصر جو ڈالر کا بھوکا ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سیاح یہاں آئیں، -----
----- مگر دوسری طرف ان کی قوم پرستی کا اشتعال غیر ملکوں کے خلاف متشدد مظاہرے بھی کراتا رہتا ہے۔

مصری حکومت چاہتی ہے کہ سیاح زیادہ سے زیادہ تعداد میں مصر آئیں مگر ساتھ ہی پاسپورٹ کے حاصل کرنے میں اتنی الجھنیں اور دقتیں پیدا کی جاتی ہیں کہ سیاح گھبرا جاتا ہے۔
مصری حکومت چاہتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ مصر میں لگے مگر اس کے لئے شرطیں ایسی رکھی جاتی ہیں کہ یہ کام مشکل ہو جاتا ہے۔ رشوت کا یہ عالم ہے کہ جو غیر ملکی، مصر میں کاروبار کر رہے ہیں وہ اپنا کام کسی دوسرے ملک میں منتقل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مصر کی اقلیتیں انھیں وجوہ پر غیر مطمئن ہیں۔ یہودی حکومت اسرائیل کی طرف نظریں لگائے ہیں اور آرمینین، روس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ مصر کو اسرائیل سے نفرت اور روس کی طرف سے شبہ ہے۔

غرض مصر میں منفی و مثبت طاقتیں متوازی کام کر رہی ہیں جیسے کسی چیز کے حرکت میں آنے سے اس کا سایہ بھی متحرک ہو جاتا ہے۔ قاہرہ کے تمدن کا تضاد انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔
لسانی اعتبار سے قاہرہ اصلاً عرب ہے لیکن کلچری پہلو سے وہ قدیم و جدید اثرات کا مجموعہ ہے قدیم و جدید آرزوں کا معرکہ ہے! وہاں پرانے اور نئے خیالات کا مجاہدہ جاری ہے! اور یہی وہ خصوصیت ہے جو قاہرہ کو ایک جیتا جاگتا ڈراما بنا دیتی ہے!

یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ دوسرے ملکوں کی راجدھانیوں کی طرح قاہرہ بھی ایک کاسما پولیٹن (مخلوط النسل آبادی کا شہر) ہے۔ اس کے برخلاف قاہرہ جو کہتا ہے وہی پورا مصر، بلکہ عرب دنیا کا ایک بڑا حصہ کرنے لگتا ہے۔ قاہرہ کا جغرافیہ، تاریخ، دولت، ضمنی امت، کلچر، سماجی ہنگامہ خیزی اور ذہنی شورش — روایتی اور جدید، دونوں قسم کی — قاہرہ کی اس سائیکالوجی کا جواز نہیں۔ قاہرہ، اپنی پر عظمت قدیمیت کے باوجود اپنی خامیوں اور گمراہیوں کو نوجوانی کے جوش میں قابل متناء

نہیں سمجھتا ہے۔ وہ اپنی نوصول اہمیت و دولت پر اس قدر نازاں ہے کہ اس نے فلاحول (کسانوں) کی حالت زار کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ اپنے وقار اور اپنے ارادے کو دنیا اور خاص کر عرب ملکوں کے سامنے اس طرح پیش کرنا چاہتا ہے جیسے کہ کوئی نوجوان لوگوں کے سامنے اپنی طاقت و جوانی کی نمائش کرے۔ مصری حکومت کے سامنے اس وقت بہت سے بین الاقوامی مسئلے ہیں! ان میں اسرائیلی حکومت اور نہر سوئیز کے علاقے اور سوڈان کا انخلاء بہت اہم ہیں۔ ان مسئلوں نے مصر میں بخار کی سی حالت پیدا کر رکھی ہے۔ وزارت خارجہ کے دفتر سے مجھے بہت سائلٹر کچر دیا گیا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سوڈان پر قاہرہ کے جو حقوق ہیں ان سے انکار ممکن نہیں، ایک اقتباس یہ ہے:-

”بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ اقتصادی ترقی اور زراعت کو وسیع کرنے کے لئے مصر کا

انحصار، سوڈان پر ہے، بنجر زمینوں کو صرف اسی صورت میں قابل زراعت بنایا جاسکتا ہے کہ آبپاشی کا انتظام ہو، اور یہ بات جب ہی میسر ہو سکتی ہے جب نیل کے پانی پر پورا کنٹرول ہونے کی اسکیم پر عمل درآمد ہو، اور طغیانوں کے پانی کا ذخیرہ کیا جاسکے اور یہ حقیقت کہ مصر کی خوشحالی کا تمام تر انحصار بالائے نیل پر پورے کنٹرول اور اس پانی کے مناسب استعمال پر موقوف ہے، مصری مدبرین سلطنت کے دماغوں میں مرتسم ہو چکی ہے، جو گزشتہ سو سال سے برابر جڑ پکڑتی جا رہی ہے!“

ایک غیر ملکی حکومت اگر سوڈان کے نظم و نسق میں دخیل ہو تو بلاشبہ نیل کا پانی روک کر مصر کی خود مختاری کو بے معنی اور اس کے وجود کو خطرے میں ڈالا جاسکتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ سوڈانیوں کو اپنے مقصد کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو مصری آتش بپا ہو جاتا ہے۔

قاہرہ کے سوڈانی باشندوں نے اپنے لئے ایک مقام بنالیا ہے۔ یہ لوگ بالعموم ادنیٰ قسم کے روزگار کرتے ہیں مگر مصری اور اجنبی سب اس پر متفق ہیں کہ سوڈانی بالعموم قابل اعتماد ہوتا ہے۔ سوڈانی قاہرہ میں ہوٹلوں وغیرہ میں خدمتگاری یا دولتمند مصریوں اور غیر ملکیوں کی نجی ملازمتیں کرتے ہیں، کچھ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں۔ یہ لوگ نہایت سنجیدہ و متین اور تمیز دار ہوتے ہیں۔ مصری جس قدر بسیار گو ہیں، سوڈانی اتنے ہی کم گو ہیں۔ سوڈانی بالعموم دراز قد، چوڑے چکلے، مضبوط و توانا ہوتے ہیں، جسمانی و اخلاقی دونوں اعتبار سے توانا! لیکن اس کے باوجود مصری وزارت خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر کے سامنے جب سوڈان کو عام رائے دہی کا حق دینے کی بات میرے منہ سے نکلی تو معلوم ہوا کہ میں نے اس افسر کی نہیں بلکہ پوری مصری قوم کی توہین کی ہے۔

مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ملکوں میں، تعلیم یافتہ عورت، خیال و عمل کے لحاظ سے اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے جتنی مصری عورت ہے۔ اور اسی طرح مصر کی جاہل اور قدامت پرست عورت کی طرح کوئی نیک بھی نہیں ہے۔

مصر کی نئی روشنی والی نسل کی لڑکیوں کو اجنبی لوگ FLAPPER (یعنی ایسی لڑکی جو عام صحبتوں میں شریک ہوتی ہو) کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ غلط ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ مصری لڑکیاں قدیم اثر و رسوخ سے ہٹ کر آزاد زندگی گزارنے پر تل گئی ہیں، ایسی باغی لڑکیوں کی گنتی اگرچہ ابھی زیادہ نہیں لیکن ان کی خود رانی متحیر کر دینے والی ضرور ہے۔ انکا نعرہ ”آزادی“ اور عمل ”خود نمائی“ ہے۔ وہ جدید تمدن کی آرایش و زیبائش کے تمام طریقے استعمال کرتی ہیں اور اپنے جسم کے سڈول پن پر یورپ کی لڑکیوں کی طرح فخر کرتی ہیں۔ ساحل پر غسل کرنے کا چست لباس، جسے مصری بڑھیاں شیطان کی ایجاد“ کہتی ہیں، لڑکیاں اسکے پہننے میں اپنی شان سمجھتی ہیں۔ مصری لڑکیاں سینما دیکھنے کی اتنی شوقین ہیں کہ ہفتے میں دو بار ضرور جاتی ہیں۔ گھر پر نوجوان دوستوں سے ملاقات کے امکان کم ہیں اس لئے سینما بہترین وعدہ گاہ ہے۔ وہ پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں شریک ہوتی ہیں اور کبھی کبھی سیگریٹ بھی پی لیتی ہیں۔ احترام نسوانیت کے خیال سے سیگریٹ نوشی عام اور شدید نہیں ہے۔ اسے بانی ووڈ کے تمام فلم اسٹاروں کے نام یاد ہیں اور غیر ملکی ملاقاتیوں کے سامنے اسے یہ کہنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ کس فلم اسٹار کو دوست بنا سکتی ہے اور کس کو شوہر۔ ایک مسلم گھر پر ایک ٹی پارٹی میں ایک لڑکی کو میں نے خود یہ کہتے سنا کہ وہ کیری گرانٹ کو دوست بنا سکتی ہے، ہربرٹ مارشل کو شوہر اور کلارک گیبل کو یہ بھی اور وہ بھی! جب میں نے اُسے ٹوکا کہ اس کے گھر والے اسے کیونکر پسند کریں گے تو بولی کہ ”میرے باپ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اور ماں سمجھتی ہے کہ میں پوری طرح گمراہ ہو چکی ہوں، دادی البتہ یہ عقیدہ باندھے بیٹھی ہے کہ ایک دن مجھے ہدایت ضرور ملے گی اور میں بے دینی کی راہ چھوڑ دوں گی۔ حالانکہ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ میں ان کی طرح کی نہیں بلکہ نئی قسم کی عورت بننا چاہتی ہوں! میں اپنی معاش کی خود کفیل ہوں اس لئے کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا، آزاد ہونا بڑے لطف کی بات ہے!“

یہ رانی اور اسلامی روایات کی پامالی کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بدتمیز ہو گئی ہیں، نفاست و شائستگی کا انھیں اتنا ہی شدید احساس ہے جس طرح جدید لباس اور بناؤ سنگھار کا! چنانچہ مصر کی جدید عورت اصل میں نتیجہ اور رمزد علامت ہے اس سماجی شورش کی جو دو عظیم جنگوں کے درمیانی وقفے میں مسلم ملکوں کے اندر ہوتی رہی ہے۔ اس شورش کو اعلیٰ اور درمیانی طبقے کی مسلم لڑکیوں کو

جدید تعلیم ملنے سے اور بھی تقویت پہنچی ہے۔

ہر چند مردوں کی طرف سے کافی مخالفت ہوئی مگر ۱۹۳۷ء سے مصری یونیورسٹی میں لڑکیوں کا داخلہ شروع ہو گیا تھا۔ آج مصر کے پانچ ہزار ڈاکٹروں میں ڈیڑھ سو عورتیں ہیں۔ ایسے ملک کے لئے جہاں یہ کہاوت ہو کہ عورت دوہی بار گھر سے نکلتی ہے، ایک شادی کے بعد رخصت ہو کر دوسرے مرکز۔ وہاں بیس سال کی مدت میں ڈیڑھ سو عورتوں کا ڈاکٹر ہو جانا واقعی حیرت کی بات ہے۔

ایران کے روشن خیال علماء کی طرح مصر کی تعلیم یافتہ عورت بھی اس کو غلط کہتی ہے کہ اسلام عورت کو کمتر سمجھتا یا اس کی کمتری کا ذمہ دار ہے۔ مسلم عورت جس اونٹے درجے میں پہنچا دی گئی ہے مصر کی تعلیم یافتہ عورت کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔
اسماء فہدی جو زنانہ کالج میں اسسٹنٹ ڈین ہے، لکھتی ہے کہ:-

”یورپ والوں کا یہ خیال غلطی پر مبنی ہے کہ اسلامی احکام مسلم عورتوں کو تعلیم دئے جانے کے خلاف ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام عورتوں کی تعلیم پر نہایت زور دیتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی بڑی خواہش تھی کہ ان کی بیویاں لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں۔ رسول خدا کی حدیث ہے کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت کا فریضہ ہے۔ اسلامی ادب میں ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے لڑکے لڑکیوں کا ایک ہی مکتب میں پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی سوانحوں میں بہت سے اذکار ملتے ہیں کہ عورتیں ادب اور مذہبیات کے مطالعہ میں ممتاز ہو سکتی اور مردوں کو لکچر دیا کرتی تھیں۔“

مصر کی یہ عالم خاتون مسلم عورت کے اس ”ذہنی و روحانی زوال“ کا ذمہ دار قدامت پرستی کو قرار دیتی ہے۔ یہ خاتون مسلمانوں کی اس جہالت و عصبیت کو اس عقیدے کا سبب قرار دیتی ہے کہ:-
”عورت کو جاہل رکھ کر چار دیواری میں بند رکھا جائے تو اس کی عصمت محفوظ ہے!“

اسماء فہدی کے اس مضمون نے ”اخوت اسلامی“ کے حلقوں میں ہلچل ڈال دی اس لئے یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہوا تو وہ کتاب شاہ فاروق سے معنون کی گئی۔

۱۹۳۷ء میں ایگریکلچر کالج میں ۳۷ مصری عورتیں داخل ہوئیں اور تین لڑکیوں نے جرأت کی اور انجینئرنگ کالج میں داخلہ کرا لیا۔ جرمنزم کے اسکول میں مردوں سے زیادہ عورتیں ہیں۔ اسی اسکول کی تعلیم یافتہ متعدد خاتونیں آج متعدد اخبار رسالے ایڈٹ کر رہی ہیں۔

بیس ہجری کا میا بیاں اور ترقیاں شہروں تک محدود ہیں۔ مصر کے دہقانی ہنوز فراعنہ کے عہد میں

جی رہے ہیں۔

مصر کی نئی نسل کی لڑکیوں کی یہ پیشقدمیاں اسی طرح سماجی اور ذہنی شورش و انتشار کی علامت ہے جس طرح طلبہ کے مظاہرے اور ہنگامہ خیزیاں۔ پورے مشرق وسطیٰ میں یونیورسٹی کے طلبہ اتنے پرجوش و عمل نہیں جتنے مصر کے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں میڈیکل طلبہ کے ایک مظاہرے کو پولس نے منتشر کر دیا تو انھیں اتنا غصہ آیا کہ تمام درسی کتابیں جلادیں اور لیپورٹری کا سامان توڑ پھوڑ ڈالا۔ مظاہرے کے تقریباً ایک لاکھ ڈالر کا یہ نقصان پولیس کا نہیں بلکہ خود ان طلبہ کا نقصان تھا۔ یونیورسٹی کھلنے پر یہ نوٹس نکلا کہ تمام طلبہ کو پہچان کے کارڈ رکھنا لازمی ہے تاکہ آئندہ اگر وہ یونیورسٹی کا نقصان کریں تو ان سے یا ان کے سرپرستوں سے وصول کیا جاسکے۔

مصر کے لوگوں میں باغیانہ اسپرٹ عام ہے، صرف نئی نسل کے لوگوں میں نہیں۔ جنگ کے بعد سے بے شمار مظاہرے اور بلوے ہو چکے اور ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مظاہرے برٹش کے خلاف ہوتے ہیں کبھی تمام غیر ملکیوں کے خلاف۔ کبھی وہ اسرائیل کا مسئلہ ہوتا ہے اور کبھی سوڈان کا۔ اور اب تو خود مصری حکومت کے خلاف بھی مظاہرے ہونے لگے ہیں۔ غرض ہنگامہ آرائی کے لئے مصریوں کو حیلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قومی اور بین الاقوامی حیلہ ہر وقت طیار رہتا ہے۔ قاہرہ کے ایک اسپرٹ تعلیم نے اس ہنگامہ آرائی کا سبب یہ بتایا کہ طلبہ کی تعداد قاہرہ میں بہت زیادہ ہے ایک دوسرے ماسٹر تعلیم نے اس طرح رائے زنی کی کہ:-

”ہمارا ملک غیر ترقی یافتہ ہے اور اپنے اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے تمام لوگوں کو کام نہیں دے سکتا!“

اور یہ سچ بھی ہے کہ حکومت نے اسی شورش کے دباؤ سے بہت سے محکمے بیکار یا ضرورت سے زائد کول رکھے ہیں تاکہ کچھ لوگ کھپائے جاسکیں اور زیادہ آدمی کھپانے کی خاطر تنخواہیں کم کی جا رہی ہیں جسکی وجہ سے رشوت کی گرم بازاری ہے، چنانچہ نوجوان طبقہ جب روزگار نہیں پاتا تو شورش پسند بن جاتا ہے مصر میں ابتدائی تعلیم عام ہے اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے۔ مگر مصر میں ابھی صرف چالیس فیصدی بچے ابتدائی درسگاہوں میں داخل ہو سکے ہیں۔ ابتدائی تعلیم پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اس کا دو گنا اعلیٰ تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مصر کی روح اس کے جسم سے زیادہ قوی اور اس کی آرزوئیں ان کے پورا ہونے کے سارے سامان سے بہت زیادہ ہیں۔ قومی انتشار کی حالت میں ایسے نوجوانوں کا ذاتی انتشار بہت زیادہ وزنی ہو جاتا ہے، جن کو غیر مذہبی قسم کی تعلیم ملی ہو۔ مصر کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوان یا تو زمیندار اور تجارت پیشہ طبقے کے

ہیں یا سرکاری افسروں کی اولاد ہیں اور نئی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ دنیا کا تازہ ترین ادب اور سیاسی خیالات ان کے مطالعے میں آتا رہتا ہے، چنانچہ ان کے سامنے ایک نئی دنیا ہوتی ہے جسے وہ پیار بھی کرتا ہے اور اس سے نفرت بھی۔ ہر ہوائی جہاز جو قاہرہ کے اڈے پر اترتا ہے تعلیم یافتہ مصری کے لئے کچھ نہ کچھ نئی چیز لپکرتا ہے اور اس کا قومی و ذاتی انتشار اس سے اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے دماغ سے نئے خیالات کو نکال نہیں سکتا! وہ مصر کی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ مصر کے غریب اور دیہات کی حالت زار برداشت نہیں کر سکتا، مگر اس اصلاح میں خود اس کے قدامت پرست گھروالے مغل ہوتے ہیں۔ یہ حالت اسے کرب و غضب میں مبتلا رکھتی ہے اور وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے غیر ملکوں سے نفرت ہے مگر وہ مصری پاشا سے بھی نفرت کرتا ہے۔ وہ عمل کا طالب ہے! دراصل وہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چاہتا ہے مگر یہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نہیں چاہتا! اسی لئے وہ کمیونزم کو اپنالیتا ہے۔ لیکن اصلاً مصری نوجوان وطن پرست ہے۔ وطن عزیز کو ترقی کی راہ میں تیزی سے گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے غم و غصہ دل میں لئے ”موتا کیا نہ کرتا“ پر عمل کرنے لگتا ہے۔

یہ حقیقت نہایت اہم ہے کہ اس ملک میں جو اسلام کا قلعہ ہے، ایسے نوجوان موجود ہیں جو اپنے باپ کو چور اور ڈاکو کے نام سے یاد کرنے میں ہاک نہیں کرتے۔ اور ایسے باپ بھی موجود ہیں جو اپنے بیٹے کو مصر کی حالت پر اظہار خیال کرتے سنتے ہیں تو ”ناپختہ جوانی کی بکواس“ کہہ کر طامال دیتے ہیں، یا اپنے تخت جگر کے ان ”عجیب خیالات“ پر کڑھتے رہتے ہیں۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ذکی الحس بیٹے نے اپنے باپ کی دولت کو پس پشت ڈال کر راحت و آرام کی زندگی بسر کرنا ترک کر دی ہے۔ اور ایسے نوجوان بھی ہیں جو ”زمیندار کا ناس!“ ”افلاس کو ختم کرو!“ ”سرمایہ داری ختم کرو!“ ”نا برابری کو مٹا دو!“ قسم کے نعروں میں بہت دلکشی پاتے اور ہر انقلاب و طوفان کو ”خوش آمدید!“ کہنے کو طیار ہیں، بشرطیکہ وہ مصر کے ان خوابوں کو حقیقت میں بدل دینے کے لئے ہو! میں نے چند نوجوانوں سے سوال کیا:-

”تم لوگ روس کی تقلید کرنا چاہتے ہو یا امریکہ کی؟“

”کسی کی نہیں! ہم یہ چاہتے ہیں کہ مصر اپنی کامل خود مختاری کی حفاظت کرے، لیکن ہم نہیں

چاہتے کہ مصری پاشا اپنے قانون داں گروگوں کو پارلیمنٹ کے ممبر بنوا کر مصری قوم کی قوت، اسکی

صلاحیت اور قابلیت کو غیر کا پابند بنا دیں!“

قانون کے ایک طالب علم نے مجھے جواب دیا۔

”مصر کی نئی نسل شدید قسم کی وطن پرست ہے، اور مشکلوں سے حاصل کی ہوئی آزادی کو نہایت عزیز رکھتی ہے اور خوفزدہ ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ کوئی مشرقی یا مغربی طاقت کسی بہانے مصر کو پھر دبوچ لے۔ اس لئے یہ لوگ لفظ انقلاب سے بھی ڈرتے ہیں۔“

حکومت مصر نے ہفتہ وار الجھپور کو کچل دینے کی کوشش کی تھی جسے ایک نوجوان پروفیسر اور کئی قانون دان اور طلبہ ایڈٹ کرتے ہیں مگر وہ زندہ رہا اور جب مصر نے اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کی تو وہ تنہا اخبار سٹاف جس نے اس جنگ کی تنہا مخالفت کی۔ مصر کے طلبہ در در جا کر اس اخبار کو پیچھے اور چندہ وصول کرتے ہیں۔ مزدور لیڈروں سے اسے مدد ملتی ہے۔ حالانکہ مصر میں مزدور تحریک اس مفہوم میں موجود نہیں جو یورپ کے ملکوں میں لیا جاتا ہے۔ مجھے ایک سفارت خانے کے ایجنسی نے بتایا کہ:-

”جس وقت فرانس میں انقلاب ہوا تو فرانس موجودہ مصر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔“

وزارت کے ایک ذمہ دار افسر نے جسے کالج چھوڑے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی۔ غلگین آواز میں مجھے اصرار کیا کہ

”ہٹلر اگر لڑائی میں جیت جاتا تو مصر کا تعلیم یافتہ طبقہ فاشزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔“

یہ اس نے صحیح کہا۔ کچھ دنوں کے لئے ”نوجوان مصر“ کی تحریک اٹھی تھی اور چند ہی دنوں میں کافی مدد حاصل کر لی تھی۔ اس کا طاقتور پریس بھی وجود میں آ گیا تھا۔ مگر اتحادیوں کی فتح نے اس تحریک کو ٹھنڈا کر دیا۔ تحریک ختم ہو گئی مگر اس کی اسپرٹ ابھی باقی ہے۔ اس اسپرٹ نے حال میں نیا روپ اختیار کر لیا ہے اور فلسطین کا مسئلہ اس کا بنیادی پتھر ہے۔

”اخوت اسلامی“ ۱۹۵۷ء سے قائم ہے۔ ایک لاکھ ممبر ہیں جس میں دس ہزار مجاہدوں کی فوج ہے اس جماعت کو غیر ملکیوں سے سخت مخالفت ہے اور مذہبی قدامت پرستی اس کا نصب العین ہے۔ اگر وہ بولشیوک کا دشمن ہے تو اسی کے ساتھ جمہوریت کا بھی ہے۔ وہ عرب ملکوں کا اتحاد چاہتی ہے اور مصر کی سیادت چاہتی ہے۔

الحاصل یہاں قدامت پرستی اور جدت پسندی کا معرکہ قائم ہے۔ شیپرڈ ہوٹل کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو میں نے دیکھا کہ جنازے پر ایک جامنی رنگ کی چادر پڑی تھی اور سر ہانے ایک طربوش (ترکی ٹوپی) رکھی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ مرنے والا صاحب اثر و رسوخ تھا۔ میت کے پیچھے سیاہ برقعے ڈالے عورتیں بین و بکا کرتی جا رہی تھیں۔ یہ سب قدامت پرستی کے آثار تھے اور ان کے ساتھ ایک بینڈ باجہ CHOPAN کا FUNERAL MARCH بجاتا جا رہا تھا۔ یہ نئے تمدن کی علامت تھی۔

نواں باب

(مصر، عالم نزع میں)

مصری کسان کا سب سے زیادہ عزیز سرمایہ اس کی بھینس ہے جو دودھ دینے کے ساتھ ہل چلانے کا کام بھی دیتی ہے۔ مصر کی رائٹ ایگریکلچرل سوسائٹی نے ایک نمونے کا گاؤں آباد کیا ہے۔ اس گاؤں میں مینے پہلی دفعہ دیکھا کہ بھینس ایک الگ کمرے میں بندھی تھی، ورنہ کاشتکار اس کو اسی کمرے میں باندھتا ہے جس میں خود رہتا ہے، اس لئے کہ وہ اس کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہے۔ یہ بھینس شمالی امریکہ کی گائے کے مقابلے میں صرف پانچواں حصہ دودھ دیتی ہے۔ مگر اس کی یہ بھینس ایک اور کام بھی دیتی ہے اور وہ یہ کہ کسان کے بچے اس کے ساتھ کھیل کود لیتے ہیں اور تالاب میں اس کو نہلانے کے وقت خوب خوش ہوتے ہیں۔

مصر میں کسانوں کے تیس لاکھ کنبے ہیں مگر بھینسوں کی گنتی صرف پندرہ لاکھ ہے، اس لئے بعض کسان دودھ کے لئے بکری پال لیتے ہیں اور باقی جو زیادہ خرچ نہیں کر سکتے، بغیر دودھ ہی کے جیتے ہیں۔ مصریوں نے ابھی دودھ کی خاطر گائے پالنا نہیں سیکھا اور اس کے دودھ کے فوائد سے واقف نہیں ہیں۔

مولشی کی یہ کمی مصر کا ایک قومی مسئلہ ہے۔ کیونکہ مصریوں کو دودھ نصیب نہیں ہوتا، ڈنمارک میں اگر دودھ کی سپلائی اسٹھائیس ہے تو مصر میں صرف ایک ہے۔ مصری کسانوں کی ادنیٰ اور گری ہوئی صحت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں دودھ نصیب نہیں۔

کسان عورتیں اگر اپنے بچوں کو دودھ نہیں دے سکتیں تو انھیں ہر وقت ادھنتی رہنے والی سیاہ چائے پلاتی ہیں۔ اور چائے کی یہ عادت مصری کسانوں میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی قمیص بھی گرد کر سکتا ہے۔

پونے دو کروڑ کے قریب آبادی رکھنے والا مصر صرف پچیس لاکھ ایکڑ زمین کاشت کرتا ہے۔ اور یہ زمین نیل کی طغیانیوں کے باعث دنیا میں سب سے زیادہ زرخیز زمین ہے۔ دنیا کی کسی قوم کی ہستی کا انحصار دریا پر اتنا نہیں ہے، جتنا مصری قوم کا دریائے نیل پر اور دنیا کا کوئی ملک اپنی زرخیزی کے لئے کسی دریا کا اس قدر ممنون نہیں جتنا مصر نیل کا ہے۔ نیل نہ ہوتا تو دنیا میں قدیم و جدید مصر وجود ہی میں نہ آتا۔

مصری آب و ہوا خشک ہے اور وہاں اوسط بارش بہت کم ہے۔ اس لئے ہر قطعہ زمین آبپاشی چاہتا ہے۔ پچیس فیصدی زمین کی آبپاشی تو نیل کی طغیانی سے پوری ہو جاتی ہے باقی کے لئے نہری آبپاشی کا انتظام ہے۔ یہ نہری آبپاشی محمد علی پاشا (۱۸۶۹ء لغایت ۱۸۷۹ء) کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ نے بھی آبپاشی کے ذرائع بڑھانے میں مدد کی ہے اور اسوان کا بند برٹش اسکیم ہی کا نتیجہ ہے۔ نیل کی طرح دوسری نعمت مصریوں کے لئے سورج ہے۔ مسلسل دس گھنٹے کی دھوپ مصر کی زمین کے لئے ایک نعمت ہے۔ پانی کی افراط اور دھوپ دونوں ملکر مصر کو قحط سالی سے بچاتے رہتے ہیں۔ یہاں کی زمین ہر قسم کی کاشت کے لئے مناسب ہے۔ روٹی تو مصر کا سونا ہے، گو قابل زراعت زمین کے صرف پانچویں حصے میں کپاس بوئی جاتی ہے، لیکن ہر آمد میں روٹی کا اوسط اتنی فیصدی رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں کی روٹی دنیا بھر کی روٹی سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی ترکاریاں، پھل اور غلہ بھی بہتر ہوتا ہے لیکن اسکے باوجود مصری کسان بھوکا، تنگا اور بیمار رہتا ہے۔

مصر میں میں نے پر شوکت اہرام بھی دیکھے، عظمت آفریں ابوالہول کو بھی دیکھا۔ عجائب خانے میں اعلیٰ صناعی کے نمونے بھی دیکھے، اور ہر منظر نے میرے اندر حیرت و استعجاب کی لہر دوڑا دی، لیکن جب میں نے مصر کے گاؤں دیکھے تو قدیم و جدید مصر کی عظمتیں میرے ذہن و خیال سے محو ہو گئیں۔ مصری کسان کچے مکان میں رہتا ہے جو بد وضع بھی ہوتا ہے۔ ورنہ مٹی گارے کے مکان بھی خوبصورت اور آرام دہ بنائے جاسکتے ہیں۔ ایگرکلیچرل سوسائٹی نے نمونے کے گاؤں میں نہایت خوبصورت اور آرام دہ مکان بنوائے ہیں جو گرمی میں سرد اور سردی میں گرم رہتے ہیں۔ مولشی ہانڈھے کا اصطبل رہنے کے کمرے سے الگ بنایا ہے۔ قبل جنگ اس مکان کی لاگت سو امریکن ڈالر کے برابر تھی اور مصری کسان کے لئے یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ لڑائی کے بعد کی گرانی میں تو اس کے لئے یہ مکان حاصل کرنا ناممکن سا ہے۔ جو مکان وہ بناتا ہے بہت سستے میں بن جاتا ہے۔ مٹی مفت اور سرکنڈے وغیرہ بھی نہایت ارزاں، اور یہی دو چیزیں اس کی تعمیر کا مسالا ہیں۔ مکان نہایت بدبودار ہوتا ہے اور مکھیوں کی انتہا نہیں۔ موسم البتہ مصری کسان کا دوست ہے اور وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ کھلے میں لہر

کرتا ہے۔

مصر کے دیہاتی پینے کا پانی تالابوں سے حاصل کرتے ہیں جن میں بچے اور مویشی نہاتے بھی ہیں۔ پانی کے گھونگے ایک خاص بیماری کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دیہاتی لوگ جو تہ پہنے والے کو دو لہند سمجھتے ہیں مرد اور بچوں کو کپڑا بہت کم نصیب ہے۔ البتہ عورت کا لباس غنیمت ہوتا ہے۔ دیہاتی عورت پر وہ نہیں کرتی لیکن اس کی عصمت و پاکبازی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

دنیا میں دیہات کے لوگ اس قدر مریض و بیمار کہیں کے نہ ہوں گے جتنے مصر کے ہیں۔ آنکھوں کی بیماری بہت عام ہے اسی لئے وہاں اندھوں کا اوسط سب ملکوں سے زیادہ ہے۔ ملیریا اور گھونگے سے پیدا ہونے والی بیماری جس کا نام ”ملہار زیا“ پڑ گیا ہے عام ہے۔ ستر، اسی فیصدی کسان اس بیماری اور داد کے مریض ہیں۔

مصر کے دیہاتی بچے اتنے ہی چونچال اور کھلندڑے ہیں جتنے کسی دوسرے ملک کے ہو سکتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ سرخ و مریض آنکھیں اور سو جے چہرے پر مکھیاں کھیل کے وقت بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مصری کسان کا افلاس و جہالت اس حد تک ہے کہ وہ ارزاں ترین دوائیں بھی خرید کر اپنے بچوں کی آنکھیں نہیں دھو سکتا۔

الغرض دنیا بھر کے ملکوں سے بہتر آب و ہوا کا مالک اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ زرخیز زمین کا مالک ہوتے ہوئے بھی، مصر میں افلاس کی انتہا نہیں ہے۔

ایک مصری ماہر زراعت کے ساتھ مجھے ایک مرتبہ قاہرہ سے ذرا دور ایک گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بازار میں وہ کسی شناسا سے بات کرنے لگا اور میں ایک صحن میں داخل ہو گیا۔ فوراً میں نے اپنے دوست کو پکارتے سنا کہ ”واپس آ جاؤ!“ پھر اس نے معذرت کے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس طرح کسی مکان میں داخل ہو جانا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے کہا کہ دن دباڑے اور آدمیوں کی موجودگی میں میرے داخل ہونے پر کوئی شک شبہ کیسے کر سکتا ہے تو اس نے بتایا کہ مصری لوگ جلدی شک کر لیتے ہیں اور جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ مصر میں قتل کی وارداتیں دیہات ہی میں زیادہ ہوتی ہیں اور اس کی وجہ پیشتر ہی بدگمانی ہوتی ہے۔

مصر میں تعدد ازواج برائے نام ہے مگر شک کی بنا پر طلاق کی کثرت ہے یہ بھی مصریوں کی بد نصیبیوں میں سے ایک بد نصیبی ہے۔

مصر کے لوگ کافی تغذیہ نہ ہونے کے باعث کمزور ہیں اور چونکہ اپنی قوت مردمی کے بارے میں

نہایت ذکی الحس بھی اس لئے حشیش کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

اپنی ان کمزوریوں کے باوجود، دنیا بھر کے کسانوں کی طرح، مصری کسان میں خوبیاں بھی ہیں۔ وہ عام مصریوں کی طرح غیر ملکیوں کو ناپسند کرتا ہے، وہ ایرانی کسان کی طرح زود آمیز بھی نہیں لیکن آپ سے تھوڑی شنا سائی بھی ہو تو اس کی کم گوئی ختم ہو جاتی ہے اور وہ کھل کر باتیں کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے حالات کے متعلق سوالات کرتا ہے۔

مسلمہ طور پر مصر کے لوگ جلدی مشتعل ہو جانے والے ہیں لیکن مصری کسان اجنبیوں کے سامنے بردبار اور خلیق ثابت ہوتا ہے۔ وہ دوسرے فلاح کے کھیتی باڑی کے کام میں بوقت ضرورت عملی مدد دینے کو ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتا اور انہیں شفقت سے رکھتا ہے۔ طلاق کا رواج عام ہے مگر بیوی سے اُلفت کرتا اور اس کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ اسے فطرت سے بھی محبت ہے اپنی زمین سے بھی وابستہ ہے اور اس کی سب سے بڑی خواہش ایک قطعہ زمین کا مالک بننا ہے؟ وہ محنت کرتا اور بار بار داری کے مولشی کی طرح ہر وقت جُتتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں مسرت برائے نام اور امید مفقود ہے۔ دودھ، گوشت، انڈا، مچھلی وغیرہ اس کی غذا کا جزو نہیں۔ ہر وقت اونٹنی رہنے والی چائے اس کی سب سے بڑی عشرت ہے۔ چائے میں کبھی شکر ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ مٹی کا تیل، صابن اور کپڑا بس اسی حد تک خرید سکتا ہے۔ جتنی اس کی قلیل آمدنی، چائے اور شکر کے صرف کے بعد اجازت دیتی ہے۔ وہ درحقیقت بے والی وارث ہے، وہ محض فطرت کے رحم پر جیتتا ہے۔ صرف ایک سورج ہے جو اس کا دوست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصری فلاح مصر کی شان و عظمت ہے اور اسی کی قوت بازو سے مصر کی خوشحالی قائم ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ مصر کی ٹریجڈی بھی ہے۔ شاہ مصر نے سماجی بہبود کے لئے تعلیم یافتہ جماعت اور سیاسی لیڈروں نے جہالت، اخلاص اور بیماریوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ یہ نعرہ میں نے ہر جگہ سنا اور یہ بھی دیکھا کہ بعض زمیندار کچھ رفاہی کام کر رہے ہیں، مگر یہ کام تو قومی عمل اور قومی ارادے ہی سے انجام پاسکتا ہے، جو یہاں مفقود ہے۔

مصر کے افلاس کی بنیاد اس کی کثرت آبادی بتائی گئی ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ دنیا کے کثیر آبادی رکھنے والے ملکوں میں ایک مصر بھی ہے۔ مصر کا علاقہ ویسے تو تین لاکھ چھیالیس ہزار میل مربع ہے، لیکن قابل زراعت زمین صرف ساڑھے تین فیصدی ہے۔ باقی سب صحرا ہے۔ چھ ہزار سال پہلے جس طرح وہ محض نیل کے ذریعہ سے رزق حاصل کرتا تھا اسی طرح آج بھی حاصل

کر رہا ہے۔ نیل کی لمبائی نو سو ساٹھ میل ہے اور ساری آبادی اس کے کنارے پر ہے۔ اس دریا میں کوئی دوسری ندی آکر گرتی بھی نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ صرف پچپن لاکھ ایکڑ زیر کاشت ہے اور دو لاکھ ایکڑ مزید زیر کاشت لائی جاسکتی ہے، اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ مصر کی زمین پر اس کی آبادی کا بڑا زبردست بار ہے۔ بلجیم بھی کثیر آبادی کا ملک ہے مگر وہاں فی کیلو میٹر صرف دو سو چھیاسٹھ آدمی ہیں اور مصر میں پانچ سو تینتیس۔

اس مشکل کا حل سوڈان کی طرف ہجرت کرنا سمجھا گیا ہے، لیکن خود سوڈان کا مسئلہ ہنوز لائیل ہے اور اس ذیل میں اب تک کوئی کام نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ افزائش نسل پر کنٹرول، یہاں شاید قابل عمل نہ ہو کیونکہ مصری کسان خیال کرتا ہے کہ قبضے بچے ہوں گے اتنے ہی کام کرنے والے بڑھیں گے۔

اعداد و شمار سے معیاد ہوتا ہے کہ یہاں ایک کنبہ چار ایکڑ زمین پر بخوبی کاشت کر سکتا ہے۔ اس لئے اس حساب سے آدھے مصری کسان نکمے اور خالتو ہو جاتے ہیں۔ اس خالتو آبادی کو وہ عراق منتقل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ مگر اس کام کے لئے بھی پہلے بہت کچھ کر لینا ہے۔

اس کے علاوہ مصر میں صنعت بڑھانے کی تجویز بھی سوچی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے لئے یہاں خام پیداوار کی کمی ہے۔ اس سے قطع نظر صنعتی پھیلاؤ کے لئے منڈی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر صنعت کی سب سے پہلی منڈی خود اپنا ملک ہوتا ہے، مگر مصر اس باب میں بھی بد قسمت ہے کیونکہ اس کے کسانوں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ قانون آراضی کی اصلاح ہو تو کسان کی آمدنی بڑھے اور اس کا مصر میں چرچا بھی نہیں ہے۔

اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ مصر کے ساڑھے سترہ لاکھ کسانوں کے پاس صرف ساڑھے سات لاکھ ایکڑ اور بارہ ہزار دو سو زمینداروں کے قبضے میں اس سے ساڑھے تین گنی آراضی ہے۔ یہ بھیانک حقیقت مصر کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے مطلع کو مکدر بنائے ہوئے ہے۔ سر زمین مصر جس طرح زمیندار کے لئے جنت ہے جس میں وہ عیش و مسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، اسی طرح وہاں کے کسان کے لئے دوزخ ہے جہاں افلاس و بیماری کے سوا کچھ نہیں۔

۶۶ پاکستان نمبر نگار کا جو فی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور میں اور ان کارناموں کو بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ تمام مقالات اڈیٹر کے قلم کے ہیں۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محمولہ پیننگار

جنوری، فروری ۱۹۵۶ء

دسواں باب

(زرعی اصلاحات یا تباہی)

میں جنگ کے دنوں میں بالائے نیل، لکسر میں تھا، تو ایک قطبی ڈاکٹر نے مجھے ایک بہت بڑے پاشا دزمیندار سے ملایا جو تہذیبی آب و ہوا کے لئے ونٹر پلیس ہوٹل میں مقیم تھا۔ پاشا کی سرخ طربوش اور اس کا ہلتا ہوا سیاہ ریشمی پینڈنا بڑا مرعوب کن تھا۔ ٹائی پن کا چمکیلا مہیرا اور اس سے بڑا انگوٹھی کا دکتا ہوا مہیرا اسکی دولت مندی کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا بہترین انگریزی لباس اور فصیح انگریزی اور فرانسیسی گفتگو اس کی تہذیب و تعلیم کا ثبوت تھے۔ وہ بے انتہا متواضع اور حد درجہ شایستہ و سنجیدہ تھا۔

اس پاشا نے انگلستان اور فرانس میں تعلیم پائی تھی اور امریکہ کی سیاحت کر چکا تھا۔ اپنی سیاحت کے اذکار بڑے جوش و انہماک کے ساتھ سناتا رہا، ایک پر جوش وطن پرست کی طرح مصریوں کی حالت زار کا ذمہ دار وہ برٹش حکومت کو سمجھتا تھا، جو مصر کے اقتصاد، کلچر اور جینیٹس کا گلا گھونٹتے رہے ہیں، اس نے کہا کہ اگر انگریز، مصر و سوڈان سے چلے جائیں تو مصر اپنی پرانی شان و عظمت کو بھر سے زندہ کر سکتا ہے۔

یہ باتیں میں نے مصر میں ہر ایک کی زبان سے سنی تھیں۔ اس لئے میں نے اس سے ایک سیدھا سا سوال کیا، ”کیا انگریزوں نے مصریوں کو زرعی اصلاحات سے روکا ہے؟“ اس نے تسلیم کیا کہ نہیں روکا ہے، تو پھر میں نے دوسرا سوال کیا: ”پھر قانون آراضی میں اصلاح کیوں نہیں ہوئی؟“ اسکے جواب میں اس نے یہ طمانے والا جواب دیا کہ: ”یہ بلند قسم کی سیاست ہے!“ میں نے اسے توجہ دلائی کہ: ”کیا برطانوی عقل و فراست، برطانوی سرمایہ، برطانوی رہنمائی نے مصر کو اور خاص پاشا کو غیر معمولی دولت مند نہیں بنا دیا ہے؟“ تو اس نے جواب دیا کہ: ”برطانیہ نے ان باتوں کا کافی معاوضہ بھی پایا ہے۔“

حقیقت امر یہ ہے کہ برٹش مداخلت کے خلاف ابھی ٹیشن کرنے سے سوڈان کو مصر سے ملا دینے کی پکار ہے۔

اور اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کر دینے سے مصریوں کا جذبہ قوم پرستی بہت زیادہ اُبھار دیا گیا ہے۔ اس سے اصل مقصد پورا ہوا ہوا نہ ہوا ہو، مگر مصری قوم اپنی مصیبتوں کو ضرور بھول گئی ہے۔ نہر سوئز کے کنارے کے علاوہ انگریزوں نے مصر خالی کر دیا ہے مگر مصری کسان کو کوئی سہولت نہیں مل پائی ہے، اس کی مفلسی اتنی ہی شدید ہے، اس کی بیماریاں وہی ہیں اور مصر کا تعلیم یافتہ طبقہ اسی طرح بے روزگار ہے۔ جب ہم ہوٹل سے نکل رہے تھے تو میرے ڈاکٹر دوست نے بتایا کہ حال ہی میں بمبئی کی وہا نے ایک لاکھ جانیں تلف کی ہیں۔ اس بیماری کے پتھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ مغربی افریقہ پہنچے اور مصریوں میں تاب مقاومت سستی نہیں اس لئے وہاں پوری طرح پھیل گئی۔

میں اس ڈاکٹر سے مصریوں کے مفلس اور مریض رہنے پر بات چیت کرتا رہا مگر میں نے دیکھا کہ وہ کھل کر اظہار خیال نہیں کر رہا ہے کیونکہ وہ مذہباً عیسائی تھا۔ میرے اس کہنے پر کہ آخر ہے تو وہ بھی مصری اس نے شدید مدد کے ساتھ کہا کہ وہ ”بے میل مصری ہے!“ پھر اس نے بتایا کہ:-
”اس پاشا کی طرح کے لوگوں نے مصر کی ترقی روک رکھی ہے۔ اس کے پاس دولت ہے اور جس طرح آپ نے دیکھا، عیش و عشرت میں پڑے ہیں۔“

اس قبیلے ڈاکٹر کے خیالات و احساسات بھی وہی تھے جو بے شمار دوسرے مسلمان مصریوں میں پائے جاتے ہیں۔ ترقی پسند خیالات رکھنے والے مصری بخوبی سمجھتے ہیں کہ صرف قوم پرستی کا نشہ سماجی اصلاح نہیں کر سکتا اور سمجھتے ہیں کہ مصر کی اقتصادی تباہ حالی میں ان پاشاؤں کی عیش پرستی کو بڑا دخل ہے۔ زیادہ مدت قائم نہیں رہ سکتی۔

وہ مصری جنہیں زراعت کی تعلیم ملی ہے بخوبی جانتے کہ مصر اپنی روٹی کی پیداوار پر انحصار کر کے بیٹھا رہے۔ حالات زمانہ بدل رہے ہیں اور ایک دن آئے گا کہ مصری روٹی بہت اعلیٰ ہونے کے باوجود دنیا کی منڈیوں میں نہیں بکے گی۔ جس طرح روس اور برازیل وغیرہ نے اپنی زرعی پیداوار کا رخ بدل دیا ہے، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مصر بھی ایسا ہی کرے۔

ایک امریکن ماہر نے مصر کی کاشت کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ:-

”مصر کو روٹی اور گہیوں کی کاشت گھٹا کر پھلوں کی کاشت بڑھانا چاہئے۔ مصر کی زمین

اور آب و ہوا اسے لیمون کا لیکچور بنانا بنا دے گی۔ لیکن جب تک قانون آراضی نہ بدلا جائے

مصر کے لئے ایسا کرنا مشکل ہوگا۔“

بلاشبہ مصر، یورپ کا لیکچور بن سکتا ہے اور ایسا ہونا مصری فلاح کے لئے نئی امیدوں کا ضامن

بن جائے گا۔ لیکن اس غریب کو تو پیاریوں نے معذور بنا رکھا ہے۔

مصر کے زرعی سائنسداں اپنے ملک کی بہبود کے لئے بہت کچھ اور بھی سوچ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ڈیری فارم، شہد اور مرغی خانے وغیرہ کی انڈسٹری کو دیہات میں بڑھانا مصری فلاح کے افلاس کو کم کر دے گا اور اس کی غذا بھی بہتر ہو جائے گی۔

مصر میں ہر دس بارہ آدمیوں کے پیچھے ایک دودھ کا جانور ہے، امریکہ میں ہر پانچ آدمیوں کے لئے ایک۔ لیکن مصری اور امریکن مولشی کے دودھ دینے کی استعداد پر نظر کی جائے تو یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

مصر نے امریکہ کے مختلف قسم کے انگوروں کی کاشت کی۔ یہ انگور اتنے اچھے تو نہ ہو سکے لیکن یورپ میں ان کی مانگ ہو گئی۔ اسی طرح کھجور، انجیر اور کیلے کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے۔ پھلوں کے علاوہ پھولوں خاص کر گلاب کے پھولوں کی کاشت کر کے برآمد کی جاسکتی ہے۔

مصر کے تمام روشن خیال لوگ متفق الخیال ہیں کہ قانون آرائی کی اصلاح لازمی و لا بدی ہے۔ حکومت مصر نے ایک وزارت سماجی بہبود کے کاموں کے لئے قائم کر رکھی ہے۔ اس وزارت کا ایک محکمہ فلاح کے بہبود کے لئے قائم کیا ہے۔ اس کا انچارج ڈاکٹر احمد حسین ہے۔ میں نے اس کی بہت تعریفیں سنیں تو اس سے ملا بھی۔ اور ان تعریفوں میں کوئی مبالغہ نہ پایا۔ ڈاکٹر حسین اپنا سارا وقت اور ساری قوت دیہاتی زندگی اور دیہاتی مسائل کے سمجھنے میں صرف کرتا ہے، اور بلاشبہ ان مسائل پر غور رکھنے والا دوسرا آدمی مصر میں نہیں ہے۔ پورے قاہرہ میں وہ سب سے زیادہ مصروف آدمی ہے وہ کھل کے گفتگو کرتا ہے اور جتنی صاف گوئی سے بات کرتا ہے اتنا ہی صاف سوچتا بھی ہے، اور پھر اسی شدت سے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ حسین سخت قسم کا حقیقت پرست انسان ہے، اور یہی نہیں کہ وہ صرف دیہی مسائل کو سمجھتا ہے بلکہ مصری تعلیم یافتہ طبقے کے محسوسات و خیالات کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اس کی نظر کسان کی مصیبت اور تعلیم یافتہ مصریوں کی بغاوت، دونوں پر ہے اور ان دونوں کا باہمی تعلق اس کے پیش نظر ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے بولا:-

”ہم اپنی قوم کو اقتصادی بے بسی اور امراض میں مبتلا رکھنا چاہیں بھی تو نہیں رکھ سکتے۔ بلاشبہ مصر کو یورپ کا کیلیفورنیا بننا چاہئے۔ اس کی ہمیں اشد ضرورت ہے کیونکہ اس سے مصری عوام کی غریبی دور ہوگی۔ لیکن اس کام کے لئے دو اصلاحیں لازمی ہیں: ایک کاشتکاری کے طریقوں میں اور دوسری آرائی کی ملکیت کے قانون میں۔ دو لاکھ ایکڑ پر رونی کی کاشت کے بدلے باغ لگائے جائیں اور سخت محنت کی جائے تو اکثر

دیہاتی بیروزگاروں کو روزگار مل سکتا ہے، لیکن زمیندار پاشاؤں کو اس پر آمادہ کرنا اور پیرانے طریقے کو چھوڑنا مشکل کام ہے تاہم اگر مصریوں کی بھوک اور بیماری دور کرنا ہے تو مخالفت کی پروا نہ کر کے قانون آراضی میں تبدیلیاں کرنا لازم ہے۔ بیس لاکھ ایکڑ نئی زمین کو قابل کاشت بنانا ہے۔ یہ آراضی صرف ایسے کاشتکاروں کو دی جائے گی جن کے پاس اپنی زمین نہیں ہے، اور کسی کو سو ایکڑ سے زیادہ زمین کی ملکیت کا حق نہ ہوگا۔ پورے زمینداروں کے پاس اگر سو ایکڑ سے زیادہ زمین ہو تو انکو اسکی آمدنی پر سو فیصدی ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ اسکے بعد زمیندار کو سو ایکڑ سے زیادہ زمین رکھنا فائدہ بخش نہ ہوگا اور وہ از خود حکومت کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔ سو ایکڑ زمین کی آمدنی سے یہ لوگ فارغ البالی کی زندگی گزار سکیں گے۔ فالتوزمین کی جو قیمت انکو حکومت سے ملے گی وہ خاص کر گھریلو انڈسٹری میں لگے گی جہاں ملکی ضرورت کا سامان طیارہ ہوگا۔ کسان جب اپنی آراضی کا خود مالک ہوگا تو اس کی آمدنی میں اضافہ اور زندگی کا معیار اونچا ہوگا، اور وہ گھریلو دستکاریوں کی پیداوار خرید کر استعمال کر سکے گا۔ چونکہ مصری کسان کو اپنی آراضی سے عشق ہے اور اس کی زندگی و مسرت آراضی ہی سے وابستہ ہے، اس لئے پیداوار میں ترقی لازمی ہوگی۔ بلاشبہ اسے آراضی کو بہتر بنانے کی تعلیم دی جائے گی، یہ محکمہ اسی کام کے لئے قائم ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ غریب کسان بہتر زندگی کا سخت آرزو مند ہے، اس لئے وہ ہماری تعلیم کو لازماً قبول کرے گا۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ ان اصلاحات کو قانون کی صورت دینے کے بعد بھی کثرت آبادی کا مسئلہ باقی رہے گا، اس نے جواب دیا:-

”ٹھیک ہے! لیکن ہم ہر کام ایک ساتھ شروع نہیں کر سکتے۔ میں ڈکٹیٹری کا قائل نہیں اور تدریجی ارتقاء کو ماننا ہوں۔ ہمارے نوجوان انقلاب لانے کے لئے بے چین ہیں مگر میں تدریجی ترقی کو مناسب سمجھتا ہوں لہذا ہماری تعلیمی ترقی کی اسکیم فلاحین کے اخلاقی اصلاح میں ہماری مدد کرے گی۔ ہم نے اس کی ابتدا کر دی ہے۔ اسکولوں میں پانچ لاکھ بچوں کو دن کا کھانا مفت دیا جاتا ہے۔ دیہات میں کلب اور سوشل سینٹر کھولے جا رہے ہیں۔ گھریلو دستکاریاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ سولہ ہزار کوآپریٹو سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ اس طرح ہم دیہات میں سماجی زندگی پیدا کر رہے ہیں اور کرتے جائیں گے۔“ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ:- ”ذریعہ اصلاحات کے قانون کا مسودہ طیارہ ہو چکا ہے اور وزارت نے اسے منظور بھی کر لیا ہے۔ اصلاحات کی مخالفت کا زور بھی کم ہو رہا ہے۔ اب ہمارے پروگرام کو ”بولشوزم“ نہیں کہا جاتا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر حسین نے کہا کہ ”زمیندار یا تو سو ایکڑ زمین کی آمدنی پر قناعت کریں گے یا پھر چند روز اور عیش منائیں اور اس کے بعد اپنا سر قلم کرائیں!“

ڈاکٹر حسین کے یہ الفاظ میں نے مصر میں اس سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں سنے تھے۔

گیارھواں باب

(نیا امتحان)

توریت میں آیا ہے کہ ابراہیمؑ کو خدا نے ترک وطن کی ہدایت کی اور وہ اپنے خاندان کو لیکر عراق سے نکلے کہ نئی جہاں تلاش کریں۔ اس سے ابراہیمؑ کے شیخ قبیلہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ توریت کا حوالہ اس زمانہ کے انسان کے لئے قصہ کہانی کا درجہ رکھتا ہے، مگر ۱۹۵۲ء کی دریافت نے ثابت کر دیا ہے کہ قدیم عراق کا مرکز شہر آرتھا جو ایک شاندار تمدن کا حامل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا وطن یہی شہر آرتھا، اس وقت کا عراق کلدانی قوم کا گہوارہ تھا اور اس قوم کے کلچری کارنامے ہزاروں سال سے اسی سرزمین میں مد فون تھے جن کو اب کھود کر نکالا جا رہا ہے۔

تین ہزار سال پہلے شہر آرتھا خلیج فارس پر ایک بندرگاہ تھا، مگر آج اس شہر کی زمین ساحل سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور جا پڑی ہے۔ سمندر پیچھے ہٹتا رہا ہے۔ والٹر لوڈر ملک نے نتیجہ نکالا ہے کہ پچھلے سات ہزار برس کے اندر سرزمین عراق پر گیارہ مختلف تمدن وجود میں آئے اور فنا ہو گئے۔ ان مختلف تہذیبوں نے جو آج فنا کی گودیں سو رہی ہیں نوع انسان کی تاریخ کو بعض حرکت میں لانے والے واقعات سے سنوارا اور بعض امٹ کارناموں سے قوی بنایا ہے۔

راہیوں کی زبان میں دو آبہ دجلہ و فرات کی وادی انسانی تمدنوں کا گہوارہ ہے، اسی علاقے میں طوفانِ فوج برپا ہوا اور مذہبی عبادت گاہیں قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے اسی سرزمین پر پیدا ہوا۔ ایک امریکن مورخ نے جماعتی عبادت گاہ بنانے کا سہرا یہودیوں کے سر باندھا ہے جن کو شاہ بابل بخت نصر قیدی بنا کر اپنے پایہ تخت بابل میں لایا تھا۔ قدیم بابل اور آج کا عراق ایک ہی چیزیں ہیں۔ بابل کے اس سینا گاہ (یہودیوں کی مسجد) نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں جماعتی عبادت کی بنیاد ڈالی۔

الف لیلہ کا بغداد، عراق کا مرکز ہے جہاں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان اور نہایت طاقتور مملکت قائم کی تھی۔ عباسی خلافت کا مرکز و مستقر بغداد تھا جہاں معروف عام اور مقبول شہنشاہ ہارون رشید حکومت کرتا تھا۔ جس کی طاقت کا جواب اسوقت کی دنیا میں نہ تھا۔

اس وقت کے عراق میں جیسی کاشت ہوتی تھی اس کی زرخیزی کی مثال یورپ اور ایشیا میں کہیں نہ ملتی تھی۔ کہاوت کے طور پر آتا ہے کہ زمین کرید دینے سے فصل مسکرانے لگتی تھی۔ ہیروڈوٹس نے اس ملک کی زرخیزی کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ ہیروڈوٹس کے علاوہ اس ملک کی زرخیزی کی شہادتیں دوسرے ذریعوں سے بھی ملتی ہیں، اور تصدیق ہو گئی ہے کہ پہلے زمانے کا عراق ”نہروں سے چمکتا اور غلے کے انباروں سے معمور رہتا تھا“ آج کے مقابلہ میں قدیم عراق کی پیداوار تین گنی زیادہ تھی۔

خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں شہر بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی، اور خوشحالی اور کلچری ترقی میں دنیا کا کوئی پایہ تخت بغداد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ سرمایہ کس سا کس بغداد کا حال سناتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

”شہنشاہی دربار شایستہ، شاندار اور بے حد مقبول تھا۔ چاروں طرف شہر آباد تھا اور بیچ میں قلعہ تھا جہاں سے نظم و نسق کے احکام ہر وقت جاری ہوتے رہتے تھے۔ ہر چیز کا محکمہ جدا تھا اور دفتروں کی باقاعدگی اسوقت کی دنیا میں بے مثال تھی۔ شہر بغداد سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا۔ تعلیم کا ہوں کا شمار مشکل تھا۔ جہاں دنیا بھر کے طلبہ، فلسفی، علماء اور شاعر آتے اور کسب علم کرتے تھے۔ دار الخلافہ کی طرح صوبائی مستقروں میں بھی عالیشان سرکاری عمارتیں تھیں۔ پوری مملکت میں ڈاک کا انتظام مکمل تھا۔ فوج وفادار، بہادر اور قاعدہ کی پابند تھی۔ گورنر اور وزراء، متدین اور ہر دہار ہوتے تھے۔ عباسی مملکت صقلیہ سے عدن تک اور مصر سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع مملکت میں نظم و نسق یکساں طور پر مضبوط تھا۔ سرکاری عہدوں پر عیسائی، یہودی، مسلم اور بے دین سبھی فائز ہوتے تھے۔ اس حکومت کے زمانہ میں جھوٹے پیغمبر، باغی جرنیل اور غاصب عمال یکسر مفقود ہو گئے تھے۔ تجارت کی وسعت اور دولت کی فراوانی نے خط اور بناوت کو دیس سے نکال دیا تھا۔ وباء اور امراض کی روک تھام کے لئے سرکاری اسپتال اور شاہی مصلح تھے“

عباسی خلافت کے دور میں علم و فن اور فلسفہ و مذہب اگر کہیں پھلا پھولا تو وہ مسلمانوں کی حکمرانی کے اندر، باقی دنیا میں ان چیزوں کا وجود نہ تھا۔ ایچ جی ویلس لکھتا ہے کہ: ”سائنسی طریقوں کو اپنانے اور استعمال کرنے میں یونان کو اگر باپ کا درجہ حاصل تھا تو عربوں کو مونہ بولا باپ کہنا چاہئے“

جدید زمانے کو علم کی روشنی لاطینی ذریعے سے نہیں، عربوں کے توسل سے ملی ہے۔ عربوں نے دوسرے کلچروں کو خاص کر ایرانی اور یونانی کلچروں کو اپنی چیز بنالیا تھا۔ صدیوں سے خوابیدہ عرب دماغ کو اسلامی تعلیمات سے ہمیں ملی اور عرب بیدار و متجسس ہو کر دنیا میں سب سے زیادہ تخلیقی دماغ ثابت ہوا۔ عرب ماہرین ریاضی نے ہم کو صفر اور الجبر دیا، علم مثلث میں قابل قدر اضافے کئے، علم ہیئت کو نہایت بلند کر دیا اور زبردست طبیب اور سرجن پیدا کئے، صدیاں گزر جانے کے بعد ان کا علم خواص الادویہ آج بھی ناقص نہیں کہا جاسکتا۔ عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ کر علم و ادب کی زبردست اشاعت کی اور یورپ کے لوگوں کو کاغذ بنانا سکھا کر موجودہ ترقی کی بنا ڈالی جس وقت یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی اور بد نظمی کے گڑھے میں پڑے تھے، عرب لوگ اس وقت ساری دنیا کی ذہنی رہنمائی کا منصب ادا کر رہے تھے اور چار سو برس تک کرتے رہے۔

بغداد کو جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں میرے ساتھ ایک عراقی ماہر تعلیم بھی تھا۔ اس نے کہا کہ:-

”یورپ کا (نشاة الثانیہ) مسلمان عربوں نے شروع کیا۔ افلاطون، ارسطو اور اقلیدس

ہم نے یورپ کو دئے۔ ہمیں نے ان کو ریاضی، طب، ہیئت اور دوسرے علم مکمل کر کے دئے

اور یورپ کو ایک مستعد و بزرگ بنادیا۔“

یہ عراقی بھی وہی کہہ رہا تھا جس کا یورپ کے تاریخ نویسوں نے اعتراف کیا ہے، البتہ اس کے بیان

میں زور زیادہ تھا: بلاشبہ یورپ عرب کلچر کا مرہون منت ہے۔ میری اسلامی ملکوں کی سیاحت میں

میں نے عراقیوں کو اس بات کو بار بار دہراتے سنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ عرب شہنشاہی کے کارناموں کو

دہرا کر پرانی عظمت و شان کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں۔ عراقیوں کو ایسے خوابوں کی

صحیح اور حسب مراد تعبیر نکلنے کی مخالفت نہ تو علم الحیات کرتا ہے اور نہ تاریخی دلائل سے ہوتی ہے لیکن

ضرورت اس بات کی ہوگی کہ عرب دنیا عہد نبوی کی طرح ایک بار پھر حرکت میں آجائے اور اسی طرح

مستحکم بھی ہو جائے! عرب قوم نے جس اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ثبوت اُس زمانے میں دیا

وہ صلاحیتیں اور قوتیں عرب دماغ میں آج بھی ہونی چاہئیں۔ آج عرب دنیا سوئی ہوئی ہے، اسے

کسی محمد کی ضرورت ہے جو اسے نیا الہام دیکر حرکت میں لے آئے!

اسلام نے ذہن انسانی کو کس قدر آگے بڑھایا اس کا اندازہ اصفہان اور قاہرہ میں مساجد

و مقابر، باغات و محلات کے فن تعمیر سے ہو سکتا ہے۔

ہلاکو کے حملے نے بغداد کو تباہ کیا، ترکی حکومت نے قدیم نظام آبپاشی کو برباد ہو جانے دیا اور

عراق کی قدیم شان و عظمت آج زیر زمین مدفون ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے بعض علمی ادارے اس شان و عظمت کے نشان و علامات زمین سے نکال کر اس کے کارنامے پیش کر رہے ہیں کہ عراق کیا کچھ رہ چکا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں برطانوی فوجوں نے عراق کو ترکوں کی حکمرانی سے آزاد کرایا لیکن آف نیشنز نے اس کی سیادت برٹش کے سپرد کر دی، اس عرصے میں عراقیوں اور برطانیہ سے کئی سخت معرکے ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنے ملک کو آزاد و خود مختار بنالیا۔ عراقیوں کی جنگی اسپرٹ اس حکومت کی بالادستی کو بھی گوارا نہیں کر سکتی، جس نے اسے چار سو برس کی غلامی سے نجات دلائی۔ لیکن آزاد و خود مختار عراق کیہنوز ایک قوم بننے کے درمیانی منزل سے گزرتا ہے۔ وسطی مشرق کی تمام مسلم قوموں میں عراق سب سے زیادہ بچپن ہے وہ انتہائی جدوجہد کر رہا ہے کہ قدامت سے باہر نکل آئے وہ قدیم روایات اور جدید علوم کی کشاکش میں مبتلا ہے، اس کا ایک پاؤں پرانی دنیا میں ہے اور دوسرا نئی دنیا میں۔ پہلی کی علامت صحرائی بدوی ہے جو آج بھی زمانہ ابراہیم کی طرح خاند بدوش ہے اور دوسری فسیح و تیز انگریزی بولنے والا طالب علم ہے۔ آج عراق نہ قدیم ہے نہ جدید۔ ذہنی اور جغرافیائی، دونوں اعتبار سے وہ ایک چولہے پر کھڑا ہے۔

وسطی مشرق کی تمام قوموں میں عراقی سب سے زیادہ جذباتی اور بے چین ہو جانے والی قوم ہے اندرون ملک کے معاملات یا بیرونی حالات میں کوئی قوم اتنی سریع العمل نہیں ہے جتنی عراقی قوم ہے۔ پچھلے چھبیس برس میں عراق کی حکومت باون مرتبہ تبدیل ہوئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازی طرفدار سی کا جتنا شدید اور کامیاب مظاہرہ ۱۹۴۰ء میں رشید الکلیلانی نے کیا ویسا کسی ملک میں نہیں ہوا۔

حال میں ایک اور بغاوت ہوئی جو برطانیہ اور عراقی حکومت دونوں کے خلاف تھی۔ ۱۹۵۷ء میں وزیر اعظم صلاح جبر اور اس کی حکومت نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا۔ بغداد کے لوگوں نے اس معاہدے کی زبردست مخالفت کی۔ قتل و خون بھی ہوا۔ جبر کی حکومت گر بھی گئی مگر عوام کی بے چینی اور باغیانہ اسپرٹ ختم نہیں ہوئی۔ بظاہر سکون ہے مگر میں بے چینی موجزن ہے۔ ملک کے اندرونی حالات اس تلخی میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ گرانی بے حد بڑھ گئی ہے اور حقیر درجے کی ضرورت زندگی کی فراہمی بھی مشکل ہے۔ بغداد کا ہوائی اڈا بہترین اڈوں میں سے ایک ہے جہاں جدید تمدن کا ہر سامان عشرت بہم ہے۔ اس پر عراقی فخر کرتا ہے لیکن اس سے اس کی تسکین نہیں ہوتی، عراقی مرد اور عورت، بوڑھا اور بچہ، روٹی اور کھجور کے لئے پریشان ہے۔

عراق میں زمینداری نظام نہیں تھا۔ ترکوں کے پنجے سے آزاد ہوتے وقت اگر زمین کو سرکاری ملکیت قرار دیا جاتا تو عراقی عوام اس بدحالی میں نہ ہوتے۔ لیکن اس وقت قبیلوں کے شیخ نے قبائلی علاقے کی زمین پر اپنا حق ثابت کیا اور وہ مان بھی لیا گیا۔ اس وقت سے زمینداری کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے اور منجملہ دوسرے اسباب کے خلاصین کی فاقہ کشی کا ایک سبب زمینداری بھی ہے۔ جس طرح سیاسی ناچنگی عراقی حکومتوں کے جلد جلد گر جانے کی وجہ ہے اسی طرح زمینداری نظام فلاح کی اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔

صدیوں کے جمود تعطل کے باوجود احیائے ثانی کا جتنا روشن مستقبل عراق کا ہے اتنا کسی اسلامی ملک کا نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ عراق اس کام کے لئے دل و جان سے مستعد ہو جائے۔ مصر کے لئے ایک دریائے نیل غذا بہم پہنچاتا ہے، عراق کے پاس دونیل ہیں، وجہ و فرات، عراق میں نہ تو مصر کی طرح بارش کی کمی ہے اور نہ آبادی کا اتنا دباؤ ہے۔ عراق کی مردم شماری مصر کے مقابلہ میں ایک چوتھائی ہے اور قابل کاشت زمین مصر سے چوگنی ہے۔ اس کے علاوہ عراق کے پاس تیل کے چٹے بھی ہیں۔ عراق کی آب و ہوا گرم ہے لیکن میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ دن بھر کام کرنے کے بعد عراقی مزدور پتھر مردہ و مضحل نہیں ہو جاتا۔ عراقی مزدور کو سست اور کاہل سمجھنا غلط ہے اس میں سستی اگر ہے تو نا کافی تغذیہ کا نتیجہ ہے۔ یا پھر دوسری بات یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مزدوروں کے سامنے کوئی وجہ تحریک نہیں ہے۔

زمانہ قدیم کی طرح عراق کی اہم پیداوار آج بھی غلہ ہے۔ وہ تمباکو اور روئی کی کاشت بھی کر سکتا ہے۔ غلہ کے علاوہ اس کے کھجور ہیں جو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ عراق میں کھجور کے درختوں کی گنتی تین کروڑ ہے۔ ۱۹۷۸ء میں ایک لاکھ چھیالیس ہزار ٹن کھجور برآمد ہوئی تھی۔ ترکی حکمرانی کے مقابلے میں عراقی حکومت نے زراعت میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آبپاشی چوگنی ہو گئی ہے کہیں کہیں کاشت میں مشینوں کا استعمال بھی ہونے لگا ہے۔

عراق کو یہ موقعہ حاصل تھا کہ زمینوں کو سرکاری ہٹا کر دوسرے اسلامی ملکوں کے لئے زرعی قانون میں اصلاحات کا دروازہ کھول دیتا، مگر اس نے وہ زریں موقعہ کھو دیا اور آج زمیندار بالادست ہے عراق میں کاشت بٹائی پر ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں کسان کو تیس فیصدی ورنہ چالیس فیصدی غلہ ملتا ہے۔ اس میں سے اسے نہری ٹیکس وغیرہ بھی دینا پڑتا ہے۔ چالیس امریکن ڈالر اور جنوبی علاقے

عراقی کسان کا افلاس جلی حروف میں لکھا ہے۔ اوسط اموات مصر کی طرح یہاں بھی زیادہ ہے۔
 ۱۹۲۶ء فی ہزار تھی۔ بچوں کی موت کا اوسط بھی ڈراؤنا ہے ۱۹۴۶ء میں ۲۲۰ دو سو ستائیس فی ہزار
 تھا۔ ہر سال سات آٹھ لاکھ انسان لیبریا کا شکار ہوتے ہیں۔ عراق میں بھی وہی بیماریاں عام ہیں جو مصر
 میں ہیں۔ بغداد میں اندھوں کی گنتی ساڑھے سات ہزار ہے اور اوسط زندگی چھبیس سال ہے۔
 افلاس اور بیماریوں کی اس شدت میں برطانیہ و امریکہ کی مدد بھی کیا کام دے سکتی ہے پینتالیس لاکھ
 کی مردم شماری میں پچیس لاکھ فلاصین کی تعداد ہے۔ زمین سے نہ فلاح کی محبت ہے نہ زمیندار کو۔ زمیندار چاہے
 تو فلاح کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری زمین پر بھیجتا ہے اور فلاح بھی بہتر آراضی پاسکتا ہے تو پرانی
 کو چھوڑ دیتا ہے۔

عراق سے بہتر جہاں دنیا میں کہیں نہیں ہیں مگر یوٹیشی کا اوسط عراق میں بہت کم ہے۔
 قوت پیداوار کے لحاظ سے عراق سب سے زیادہ دولت مند ملک ہو سکتا ہے مگر سب سے زیادہ غلٹ
 ہے۔ یہ نو زائیدہ قوم شدید قسم کی سیاسی قوم ہے مگر استحکام سے محروم ہے۔ عراق کا تعلیم یافتہ طبقہ آس پاس
 کے ملکوں میں لبنانیوں کے علاوہ سب سے زیادہ نچتہ مغز ہے لیکن عراق کا زمیندار سب جگہ کے زمینداروں
 سے زیادہ نا سمجھ اور ضدی ہے۔
 عراقی لوگ عرب بھی ہیں اور مسلم بھی مگر محمد کے یہ الفاظ بھلا چکے ہیں کہ ”میں نے تمہیں زمین دے کر
 برکت دی ہے! کھاؤ اور پیو اور ضایع مت کرو!“

”نگار“ کے مکمل فائل

از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۲ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۲ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۳ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۳ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۴ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۴ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۵ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۵ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۶ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۶ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۷ء مکمل فائل بلا جلد قیمت چھ روپے	از جنوری لغایت دسمبر ۱۹۳۷ء مکمل فائل بلا جلد قیمت سات روپے

محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ پتہ: — س — ذ — معرفت نگار۔ لکھنؤ

بارہواں باب

(تل عقیف)

فلسطین کے ہوائی اڈے سے ایک امریکن ہوا باز نے مجھے اپنی کار میں شہر پہونچا یا۔ راستے میں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پہلی دفعہ تل عقیف آیا ہوں۔ میرے بتانے پر کہ یہ میری پہلی سیاحت تھی اُس نے کہا:-

”یہ شہر ایسا ہے جہاں امریکن اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ وہ امریکہ ہی میں ہیں۔ اکثر امریکن چھٹیاں منانے یہیں آتے ہیں۔“

تل عقیف کی تعریفیں میں نے اکثر سنی تھیں، اور عقیف کا نظارہ میرے لئے حیرتناک نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن جب میں شہر کے اندر داخل ہوا تو میری حیرت کی حد نہ تھی۔ دن ڈھل رہا تھا، ہماری موٹر آہستہ خرامی سے کشادہ بازاروں سے گزر رہی تھی، اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں جسمانی و روحانی دونوں اعتبار سے کسی معجزہ شہر میں پہونچا دیا گیا ہوں۔

شہر زندگی اور زندگی کے ہنگامہ سے معمور تھا۔ ہر سڑک پر موٹروں کی قطاریں دکھائی دیتی تھیں۔ پٹریاں پیدل چلنے والوں سے بھری تھیں، اور دوکانیں مال اسباب سے۔ دوکانوں کی رونق و نمائش دیکھنے کے قابل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی حرکت زیادہ اور شہر چھوٹا ہے، جیسے کسی نوجوان کو اس کے بچپن کے کپڑے پہنا دئے جائیں۔

یہاں نہ تو کثیر دولت کی علامت تھی اور نہ شدید افلاس کی۔ نہ تعیش کے نشان تھے نہ احتیاج کے۔ مصر و ایران کی طرح یہ دو انتہائی صورتیں تل عقیف میں کہیں نظر نہ آتی تھیں۔ گداگروں کی قطاریں اور گلیوں میں بے والی وارث چھوکرے مفقود تھے۔ باربر داری کے اونٹوں اور گدھوں کے قافلے نظر نہ آتے تھے کیونکہ مال و اسباب کی ڈھلائی موٹر ٹرک سے ہوتی ہے، انجن نے انسانی مشقت کو ہلکا کر دیا ہے

ہوا کے ساتھ گرد کا اڑنا البتہ ثابت کرتا تھا کہ صحرا قریب ہے، یا پھر لاؤڈ اسپیکر عبرانی زبان کی وجہ سے بتاتا تھا کہ یہ امریکہ نہیں ہے۔

مجھے اسلامی ملکوں میں سفر کرتے چھ مہینے ہو چکے تھے اور ہر موقع پر یورپین ڈاکٹروں سے یہی سنا تھا کہ کھانے پینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ بس میں سفر کرتے ہوئے ایرانی ساتھیوں کے ساتھ میں نے بھی تازہ و خوش رنگ انگور خرید کر کھائے تھے اور اس کے چرمانے میں معدے کی شکایت میں مبتلا رہ چکا تھا، لیکن تل عقیف پہنچ کر میں نے تل کا پانی نہایت آزادی کے ساتھ پیا اور ہوٹل کی خاد سے سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوئی کہ پانی اُہال لیا گیا ہے یا نہیں۔ اس قسم کی احتیاط کرنا میرے اوپر لازم ہو گیا تھا، لیکن یہاں کے بازار میں تازہ پھل اتنے اچھے معلوم ہوئے کہ میں نے ایک تھیلا بھر خریدے اور ان کو کھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں قضا سے بچے نظر رہا ہوں۔

بازار بقیعہ فور بنے ہوئے تھے۔ عمارتیں یک منزلہ ہیں اور بالعموم سفید۔ اونچی عمارت بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ قاسرہ کی طرح یہاں بھی کیفے اور ریسٹوران بکثرت ہیں۔ چائے اعلیٰ قسم کی سرجگہ پینے کو ملتی ہے۔ تہوہ، امریکن مذاق نہیں بلکہ یورپین ڈھنگ پر طیار کی جاتی ہے۔ بیرے خدمت کار جہذب اور مستعد ہیں۔

تل عقیف اگرچہ رگیزار پر آباد ہے مگر وہاں برگزار کی کثرت ہے۔ چار میل لائنے ساحل کے ساتھ ساتھ خوشنما پارک ہیں جن میں خوبصورت صحرائی سرو اور دوسرے درختوں کی قطاریں دل کو بھاتی ہیں تل عقیف آباد کر کے یہودی قوم نے فطرت کے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیدیا ہے، باغ و راغ کی کثرت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ریگستان سے جنگ کرنے میں یہودیوں نے پوری طرح معلوم کر لیا ہے کہ وہاں کس قسم کے درخت نشوونما پاسکتے ہیں۔ یہ شہر جدید تعمیر ہے مگر اس میں عمارتی شان و عظمت کا نہیں بلکہ نفاست و آرام کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ صرف ایک کالج کی عمارت ہے جس پر گنبد نظر آتا ہے ورنہ سب جدید وضع کی عمارتیں ہیں۔ یہ بات صاف محسوس ہوتی ہے کہ شہر کی تعمیر میں عہد انجیل کا کوئی خیال درمیان نہیں آیا۔ اور مصر و ایران کے برخلاف اس شہر کی کوئی چیز قدامت کی یاد نہیں دلاتی۔ ٹرکوں اور بازاروں کے نام البتہ انجیل سے لئے گئے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان دوگوں کے نام پر بھی بازار آباد کئے گئے ہیں جنہوں نے صیہونی تحریک سے ہمدردی کی ہے۔

پوری دنیا میں تل عقیف ہی خالصاً یہودی شہر ہے، جسے یہودی ہاتھوں نے بنایا اور جس میں یہودی ہی آباد ہیں، یہاں یہودیوں کی حکمرانی ہے اور جس کی دولت و ناموری یہودیوں ہی کے باعث ہے

جہاں عبرانی سرکاری زبان ہے۔ (البتہ انگریزی زبان کو ثانوی زبان کا درجہ حاصل ہے اور بوڑھے بچے ٹیکسی ڈرائیور اور پولیس میں بھی انگریزی بول سکتے ہیں) سڑکوں کے نام کی تختیاں عبرانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اسکولوں میں عربی بھی لازمی مضمون ہے۔

فلسطینی یہود کی نئی نسل جو نفرت کی آب و ہوا میں پیدا ہوئی اور مجاہدے کے ماحول میں پروان چڑھی نہایت مضبوط و جفاکش ہے اور جتنی جفاکش ہے اتنی ہی خوش و خرم بھی ہے۔ یہودی نوجوان جس انہماک سے کتابوں پر جھکے دکھائی دیں گے، اسی دلوے سے ہل بھی چلاتے نظر آئیں گے۔ اس نسل کے دل میں داخلی یا خارجی قسم کا کوئی خطرہ جگہ نہیں پاسکا ہے۔ وہ بڑی بے خوف نسل ہے، اور اپنے ماضی یا مستقبل کو جذبات کی عینک سے دیکھنا نہیں جانتی۔ وہ تحقیر و تذلیل کو برداشت کرنا نہیں جانتی، کیونکہ اس نئی نسل میں خود اعتمادی اتنی ہی وسیع ہے جتنا تل عقیف کا آسمان وسیع ہے۔ ایک انیس سال کے لڑکے کے الفاظ ہیں:

”آنسو بہانا ہم بھول چکے اور رحم کی التما کرنا چھوڑ چکے ہیں! ہمارے باپ دادا کے طریقے اب ہمارے کام کے نہیں، ہم یا تو جیئیں گے یا مر جائیں گے!“

یہ لڑکا جس وقت یہ بات کہہ رہا تھا تو اس میں جوش و جذبہ مطلق نہ تھا بلکہ نہایت سکون و سنجیدگی کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جو خیال و احساس لڑکوں میں ہیں وہی لڑکیوں میں بھی پائے جاتے ہیں، لڑکیاں نیکر پہنتی، بال ترشواتی اور غازہ لگاتی ہیں۔ مگر ان میں متحرک و ایرانی کی جدید لڑکیوں کی سی نزاکت آبیان نہیں ہیں بلکہ وہ بیسویں صدی کی بچیاں ہونے کے اعتبار سے اس نظریہ کی قایل نہیں کہ مردان سے زیادہ مضبوط اور زیادہ اہل ہوتے ہیں۔ وہ آنسو بہانے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے کو نہایت کا زور نہیں سمجھتی ہیں۔ ہوٹل میں میری ملاقات ایک یہودی لڑکی سے ہو گئی، میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ لڑکیوں کا دھڑنگیز جماعت میں شامل ہونا پسند کرتی ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ:

”میں ہر اس بات کو پسند کر سکتی ہوں جو ہمیں ہمارے وطن کو آزاد رکھنے کے لئے ضروری ہو۔“

۱۹۶۸ء میں جافہ کے ساٹھ یہودیوں کی جماعت نے، جافہ کے مضافات میں تل عقیف کی بنیاد ڈالی تھی اس وقت تل عقیف کا وجود ایک واہمہ و خیال کا درجہ رکھتا تھا اور آج کا شہر ایک ٹھوس حقیقت ہے مبینوں کی مدد کے بغیر صرف ہاتھوں کے اوزاروں سے کام لیکر جافہ کی ایک نئی مضافاتی آبادی قائم کرنا اس جماعت کا مقصد تھا۔ ریکزارد سے مقابلہ کرنا یقیناً حوصلے پست کر دینے والا تھا، لیکن اس چھوٹی سی جماعت کا جوش اور جذبہ کسی وقت کمزور نہیں پڑا۔ ابتدا میں صرف تین سو آدمی وہاں آباد ہوئے تھے۔ اچانک پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور ترک حکمرانوں نے ان یہودیوں کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا۔ لیکن

۱۸ء میں جب اتحادیوں کی فتح ہوئی تو وہ یہودی پھر وہاں جا کر آباد ہو گئے اور آبادی اٹھارہ سو ہو گئی۔ پھر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ یہودی ترک وطن کر کے تل عقیف میں آباد ہوتے رہے، ۱۹۴۵ء میں بارہ ہزار، ۱۹۴۶ء میں ایک لاکھ بیس ہزار اور آج دو لاکھ کی آبادی ہے۔ شہر کی تعمیر جاری ہے، تل عقیف کے ”ٹاؤن کلارک“ مسٹرندیوی نے مجھے بتایا کہ ”ان کا مقصد یہ ہے کہ ہر کنبے کے پاس اپنا ذاتی مکان ہو۔“

فلسطین کو وطن بنانے والوں میں بہت سے قابل اور ماہرین فن بھی شامل تھے جنہوں نے شہر کی تعمیر میں حصہ لیا۔ آج کچھ بوڑھی عورتوں کے علاوہ وہاں کوئی بے پڑھا لکھا نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ایک کروڑ ڈالر کے بجٹ میں سے سٹی کونسل نے تیس لاکھ ڈالر صرف تعلیم پر خرچ کئے تھے۔ بچوں کی تربیت اور تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اسپورٹس کی بڑی قدر ہے۔ نشر و اشاعت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، دو لاکھ کے شہر میں بارہ روزانہ اخبار نکلتے ہیں۔ دس عبرانی زبان میں اور دو جرمن زبان میں، کیونکہ جرمنی سے آئے ہوئے یہودی عبرانی زبان کے ماہر نہیں ہو سکے ہیں۔ اس وقت بہت زیادہ کام دوسری زبانوں کے کلاسکس کو عبرانی میں منتقل کرنے پر ہو رہا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں کتب فروشوں کی دوکانوں کی کثرت ہے اور پانچ لاکھ ڈالر کی کتابیں دوسرے ملکوں سے درآمد کی جاتی ہیں۔ اسی طرح تین لاکھ ڈالر سالانہ کے اخبار رسالے دوسرے ملکوں سے آتے ہیں۔ شہر میں پانچ بڑی لائبریری ہیں۔ اصفہان میں میں نے دو لائبریری دیکھیں جہاں کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک محدود ہے۔ تل عقیف میں موسیقی کو بھی بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ تھیٹر روز افزوں ترقی پر ہے اور دنیا کے بہترین ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔

تل عقیف میں ایک کلچری ادارہ ایسا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ہے وہاں کی پریس ایسوسی ایشن ہر ہندوہویں دن ایک ادبی اجتماع کرتی ہے جس میں اڈیٹر اخبار نویس، ادیب و شاعر جمع ہوتے اور اپنا تازہ کلام پیش کرتے ہیں۔ اس شہر میں اظہار خیال کی کامل آزادی ہے اور یہاں کا ادب کسی سیاسی نظریے کے سانچے میں ڈھل کر نہیں نکلتا، حالانکہ تل عقیف کلچری اعتبار سے اس وقت کڑھاؤ میں اہل رہا ہے۔ یہاں شہرے والوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں (بلونڈز) اس کثرت سے ہیں جتنی آپ زیورچ یا پراگ میں دیکھیں گے۔ میں نے جب اس حقیقت پر حسرت ظاہر کی تو ایک ممتاز اہل قلم نے کہا کہ:-

”شاید خدا کی مرضی یہی ہے!“

جافہ کے عرب باشندے بھی سامی نسل ہیں مگر ان میں اور فلسطین کے یہودیوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ زبان اور عادات و اطوار سے قطع نظر جماعتی ساخت میں بھی فرق ہے اور ذہنی انداز بھی مختلف

ہے۔ تل عقیف کے یہودی خود بھی پچاس مختلف قوموں کا مجموعہ ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ بچے بھی جو فلسطین میں پیدا ہوئے ہیں، سامی نسل کے نہیں معلوم ہوتے :- ان میں یہودیت کی کوئی علامت نظر نہیں آتی اس پہلو سے بھی فلسطین ایک اڈٹا ہوا کڑھاؤ ہے۔

تل عقیف کے لوگ بالعموم یورپین وضع کا لباس پہنتے ہیں جو یورپین کم اور امریکن زیادہ ہے۔ میں نے لوگوں کو اتنا خوش پوش دیکھا تو سوال کیا کہ کیا یہاں کوئی شخص غریب نہیں ہے۔ تو میرے ایک دوست نے جواب دیا :-

”بلاشبہ یہاں غریب بھی ہیں۔ لیکن سب متمدن ہیں“

الغرض تل عقیف اتنا مصروف و منہک شہر ہے اور وہاں اس قدر حرکت و عمل ہے کہ دو لاکھ کی آبادی پانچ لاکھ کی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی شخص نکما اور بیکار نہیں، تجارت و صنعت، طباعت و اشاعت ادب و علم، موسیقی و رقص، سبھی پر کام ہو رہا ہے اور بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ پورے مشرق وسطیٰ میں تل عقیف ہی ایسا شہر ہے جہاں چودہ سال سے کم عمر بچے سے کام لینا جرم ہے اور یہ قانون نافذ العمل بھی ہے۔ تل عقیف اب ہیرا تراشی کا خاص مرکز بن گیا ہے۔ سلاخہ میں اس کی ہیرے کی برآمد سوا دو کروڑ ڈالر کے قریب تھی۔ اس شہر میں شان و شوکت کی نمائش کا سراغ نہیں ملتا اور محنت و مشقت کے علامات سہر جگہ نمایاں ہیں۔

دوران گفتگو میں ایک جرمن یہودی نے مجھ سے کہا :-

”ہم نے اگر ریگستان پر فتح پا کر اسے باغوں سے ڈھک دیا ہے تو ایک دن ہم عربوں سے معاملہ

کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔“

ان الفاظ میں سمجھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ادیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ادیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپیہ (اللہ ہر) علاوہ محصول۔

یہ منیجر نگار لکھنؤ

تیسرا سوال باب

(ایک نیا سماج)

جس روز میں نے فلسطین کی سرزمین پر قدم رکھا اُس کے دوسرے ہی دن سے سخت قسم کی بارشیں شروع ہو گئی۔ چونکہ فلسطین پہنچ کر (قاہرہ و طہران کی جمہوری حالت دیکھنے کے بعد) مجھے حرکت و عمل کے دیکھنے کا پہلا موقع ملا تھا، اس لئے مجھے فلسطینی دیہات سے بڑی توقع ہو گئی تھی۔ بارش کی کثرت یقیناً میری دیہاتی سیاحت میں مارج ہوتی اگر فلسطین کی بہترین سڑکیں میری مدد نہ کرتیں۔

پہلے میں اس گاؤں میں پہنچا جس کا نام غوات برنیر ہے۔ اس کے متعلق مجھ سے بڑی تعریفیں کی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ یہ محض مثالی اور نمونے کا گاؤں نہیں ہے جیسا عام طور سے تقریباً ہر ملک میں ہو رہا ہے بلکہ پورے فلسطین میں سب سے زیادہ سائنسی طریق پر منظم اور پوری دنیا میں ایک نئے سماج کی حیرتناک لہارٹری (معمل) بھی ہے۔ گاؤں کی پوری آبادی جمہوری اصول خود مختاری پر امداد باہمی کے طریقوں پر کاشت کرتی اور زندگی گزارتی ہے۔ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے، نہیں کہا جاسکتا مگر بحالت موجودہ اس میں شک نہیں یہودیوں نے نہ صرف طریق کاشتکاری بلکہ طرز زندگی کو بدل کر معجزہ پیش کیا ہے۔

اپنی سیاحت میں میں نے زراعت کے ترقی پسند طریقوں کا خاص طور پر معائنہ کیا ہے، اور کناڈا میں رہ کر وہ گاؤں میں نے دیکھے ہیں جہاں DUKH BOR جماعت کے لوگ زار روس کے جبر و تشدد سے بھاگ کر آباد ہوئے تھے اور مذہبی عقیدے کی طرح نجی ملکیت کے خیال کو تیاگ کر مشترک زراعت پر منظم ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی جفاکشی نے ان کو اپنے مقصد میں کامل طور پر کامیاب کیا، مگر چونکہ جدید تعلیم اور کلچری ترقی سے متنفر رہے اس لئے یہ جماعت اپنے لیڈر کی محکوم بن کر رہ گئی۔ جن دنوں میں وہاں گیا تھا، انکا لیڈر پیٹرو ویری گین تھا جو کسی طرح روسی زار سے کم نہ تھا۔ بجز اپنے لیڈر کی حکمرانی کے یہ جماعت کسی

اور کے حکم سے واقف بھی نہ تھی۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا ان کا فرض ہے۔ پیر جب سفر کرتا ہے تو دو نوجوان لڑکیاں اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں نے مشترک کاشت میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے مگر ان کے بیڈرنے ان کو جو سماجی درجہ دیا ہے، اگر ٹالسٹائی اس کو دیکھتا یا تصور میں لاسکتا تو رو پڑتا۔ یہ روسی کاشتکار ٹالسٹائی کے درد سے روس سے نکل کر کناڈا میں آباد ہوئے تھے۔

اسی طرح میں نے روس میں مشترک کھیتی کا قانون جاری ہونے سے پہلے شمالی قفقاز کی دو آبادیاں دیکھی تھیں جہاں مشترک زراعت قائم ہو چکی تھی۔ ایک آبادی روسیوں کی تھی دوسری خینتوں کی اور یہ سب امریکہ میں اچھی کاشتکاری کر کے خوشحالی سے بسر کرتے تھے۔ مگر جب روس میں انقلاب کامیاب ہوا تو یہ لوگ اپنا سامان اور زمینیں فروخت کر کے روس چلے آئے اور مشترک سرمائے سے مشترک زراعت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ امریکہ سے بہترین قسم کے آلات زراعت ساتھ لائے تھے اور امریکن کاشت کے جدید طریقوں سے واقف تھے۔ ان دونوں بستیوں نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ نمونہ و نمائش کی چیز بن گئیں ان کا کلچری اور زندگی معیار آس پاس کے دیہات سے بلاشبہ بہت اونچا تھا۔ لیکن جب روس میں مشترک کھیتی کی اسکیم پہ عمل درآمد ہوا تو یہ دونوں بستیاں بھی اس میں مدغم کر دی گئیں۔

چونکہ یہ مثالیں میرے تجربے میں آچکی تھیں اسلئے فلسطین کے اس گاؤں کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا تھا مشترک کاشت و زراعت کے تجربے اکثر کئے گئے، کہیں ناکام رہے اور کہیں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی یا ایک پہلو سے پوری کامیابی ہوئی اور دوسرے پہلو سے قشہ رہے۔ لیکن فلسطین میں یہ تجربہ بہم وجود کامیاب ہے۔ یہ مشترک کاشت و مشترک سماج کسی سیاسی نظر سے بوجھل نہیں ہے اور اس کو کامیاب بنانے والے یہودی نوآبادکاروں نے اپنے لئے ایک معزز مقام حاصل کر لیا ہے۔ اسرائیل میں فلسطین میں ایسی نوآبادیوں کی تعداد ایک سو چھیاسٹھ تھیں اور اب برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔

یہودی دماغ نے اس اشتراک عمل اور امداد باہمی کا جو کارنامہ پیش کیا ہے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کرنے کے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہاں ابھی تک اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی قانون جاری نہیں ہے۔ زیادہ زرخیز اور نفع بخش علاقے اس وقت بھی نجی ملکیت ہیں جن میں حکومت یا سماج کسی طرح مداخلت نہیں ہو سکتی۔

اس صدی کے اوایل میں جب یہودیوں نے زمینیں خریدنا شروع کیں تو ان کے وہی تیور تھے جو عرب زمینداروں کے ہیں۔ یہودی زمیندار بھی ایک نیا آفندی بن گیا تھا۔ چنانچہ یہودی زمیندار اور یہودی مزدوروں میں مزدوری کی کشاکش ضروری ہو گئی، اور بالآخر مزدور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس بلا سے

نجات صرف امداد باہمی کے اصول پر عمل کرنے سے مل سکتی ہے، اس خیال و تصور کو تعلیم یافتہ طبقے کی ہمدردی سے بھی تقویت پہنچی جس میں صیہونی تحریک کے لیڈر بھی شامل تھے۔ جو زون بنفیل نے جو دغانیہ نوآبادی کے ڈائریکٹروں میں سے ایک ہے، لکھا تھا کہ:-

”کاروبار زراعت میں ہم امن کے خواہشمند ہیں، ہم نے کھیتوں میں مزدوری کی ہے اور اس تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔“

فلسطین میں امداد باہمی کے اصول پر آباد ہونے والے لوگوں کو ”یہودی قومی فنڈ“ سے زمین خرید کر بلا قیمت دیدی جاتی ہے۔ البتہ دو فیصدی سالانہ بطور لگان کے وصول کیا جاتا ہے شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ زمین لینے والے مزدور کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود کاشت کریں گے۔ اس شرط کی خلاف ورزی کرنے پر زمین سے بیدخل کئے جاسکتے ہیں ورنہ اُنچاس برس کا پٹہ ہی عملاً دائمی پٹہ ہوتا ہے اور وہ زمین کاشتکار کی اولاد میں وراثتاً بغیر جہٹری کے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ فصل خراب ہو جانے کی صورت میں لگان کی رقم بتدریج وصول کی جاتی یا معاف ہو جاتی ہے۔ ان شرائط کی وجہ سے کسان اپنی زمینوں کو بہترین حالت میں رکھنے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ اور کاشتکار کے یہ حقوق صرف یہودیوں کے لئے نہیں بلکہ عربوں کے لئے بھی ہیں۔

اس حقیقت کا اندازہ کر لیا گیا ہے کہ اصول اشتراک پر کاشت کرنا اور سوشلزم کے اصول پر دیہاتی نظام بنانا مخصوص طبقہ مزاج کے لوگوں کے لئے ہی مناسب ہو سکتا ہے، سب کے لئے نہیں۔ اس لئے ایسے گاؤں الگ آباد کئے گئے ہیں جن کو چھوٹے کاشتکاروں کی آبادیاں کہا جاتا ہے۔ اس تنظیم میں ایک کنبہ کو اکائی بنایا گیا ہے اور اس لئے کہ چھوٹے بیوپاری کا مال نسبتاً کم قیمت پاتا ہے، ایسے ہر گاؤں کی ایک کوآپریٹو بھی بنادی گئی ہے، اور بڑی مشینیں جنہیں ایک کاشتکار نہیں خرید سکتا، مشترک سرٹے سے خریدی جاتی ہیں۔ یہ کوآپریٹو گاؤں کی ضرورت کی ساری چیزیں اکٹھا خرید کرتی اور اسکی ساری پیداوار اکٹھا کر کے فروخت کرتی ہے کوئی بیمار پڑتا ہے تو پڑوسی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس کی کاشت پر جا کر کام کریں۔ گاؤں کے اجتماعی کام گاؤں پنچایت طے کرتی ہے۔ شہر تک ایسے تراسی گاؤں آباد ہو چکے تھے۔

جن لوگوں کی انفرادیت پسندی کو اتنا بھی گوارا نہیں، ان کے لئے ایک اور اسکیم جاری کی گئی ہے جسے درمیانہ کاشتکاری گاؤں نام دیا گیا ہے۔ ایسی آبادیوں کے لوگ جتنا ان کی پونجی ساتھ دیتی ہے، زمینیں خرید لیتے اور اس پر خود کاشت کرتے ہیں اور مزدور بھی لگا سکتے ہیں۔ شہر تک ایسی

نوآبادیوں کی تعداد دہنیتس تھی۔

ان نوآبادیوں میں یورپ سے آئے ہوئے وہ یہودی زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جو تعلیم یافتہ ہیں یا شہروں سے آئے ہیں۔ یورپی دیہات کا آدمی اتنا زیادہ کامیاب نہیں ہے۔

غرض، جب ہم موٹر سے غواط برنیر جا رہے تھے تو راستے میں بہت سے گاؤں پڑے اور پھر یہاڑی کے ڈھلان پر چڑھ کر ہم غواط برنیر پہنچے۔ اس گاؤں میں بارہ سو پچاس آدمیوں کی آبادی ہے۔ چھ سو پچاس بچے ہیں اور چھ سو مرد عورت ہیں۔ ہر چند یہ سب یہودی ہیں مگر مختلف آب و ہوا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے ہیں، جنہیں کاشتکاری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو یہودی بھی نہیں سمجھتے۔ اٹلی کے یہودی اپنے تئیں یہودی مذہب کے اٹالیوی کہتے اور سمجھتے تھے، ایسے ہی عیسائی اپنے تئیں اٹالیوی کہتے سمجھتے تھے۔ قومیت سب سے بالا تر تھی لیکن جب مسولینی پر ہٹلر کا سایہ پڑا تو ان یہودیوں کو بھی سامی دشمنی کا تجربہ ہوا۔ اور یہ لوگ وطن میں غریب لوطن بن گئے، وطن بہر حال تلاش کرنا تھا اور وہ انھوں نے فلسطین کو بنایا، اور غواط برنیر میں بس گئے۔

یہ گاؤں ۱۹۴۷ء میں آباد کیا گیا۔ پہلی جماعت جب اس مقام پر پہنچی تو کوئی گاؤں یا مکان نہ تھا صرف زمین تھی۔ ڈیروں میں سکونت اختیار کر کے یہ لوگ کام میں جٹ گئے۔ شروع میں صرف بچیں ایکڑ زمین جوتی گئی۔ جب آبادی بڑھی تو زمین بھی اور مل گئی۔ اب یہ چھ سو کاشتکار پونے نو سو ایکڑ زمین پر کاشت کرتے ہیں۔

ایک ایک مکان کے اندر جا کر اور کھیتوں پر پہنچ کر ان کی سلیقہ شعاری دیکھی تو حیران رہ گیا کسی جگہ جنگلی جڑی بوٹی بھی تو نظر نہیں آئی۔ البتہ حال کی بارش سے کچھ کٹے پھوٹ آئے تھے۔ پیتالیس ایکڑ زمین پر باغ ہی باغ ہیں، جہاں سیب، نارنگی، انگور، لیمو اور دوسرے پھل اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں جتنے کیلیفورینا کے۔ بعض چیزوں کی تو چار چار فصلیں اترتی ہیں۔

پورے رقبے میں ڈھائی سو ایکڑ نہری زمین ہے باقی بارانی۔ بارانی زمین پر غلہ بویا جاتا ہے۔ ہر چند یہ زمین غلہ پیدا کرنے کے لئے مناسب نہیں اور اوسط پیداوار بہت کم ہے لیکن فلسطین کے لوگوں کو کھانے کے لئے غلہ بھی تو چاہئے، نہری زمین گاؤں کی آبادی کے لئے بے حد فیض رساں ہے۔ پچھتر ایکڑ زمین پر چارہ کی غرض سے مکئی اور سورج مکھی کی کاشت کی جاتی ہے جس کے بیج سے کھانے کا تیل بھی نکل آتا ہے۔ مزید تیس ایکڑ ترکاریوں کے لئے وقف ہے اور تین فصلیں اترتی ہیں جو غواط اور تل عصف میں صرف ہوتی

ہیں۔ ساتھ ہی پھولوں کی کاشت بھی ہوتی ہے جو بہت نفع بخش ہے۔ باغات کے علاوہ ایک بڑا رقبہ ناکستان کا ہے۔

کاشت کرنے کے طریقے اتنے عمدہ ہیں کہ مجھے گاؤں سکریٹری سے پوچھنا پڑا کہ یہ لوگ اتنے ماہر کاشتکار کیسے بن گئے۔ اس نے زرا سوچ کر جواب دیا کہ :-

”ہم اس پر مجبور تھے! اور چونکہ سب تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے سیکھ بھی جلدی لیا!“

سب سے زیادہ حیرت مجھے گاؤں کی ڈیری دیکھ کر ہوئی۔ مصر و ایران میں دو ایک جگہ کے علاوہ مجھے دودھ دینے والے اچھے جانوروں کے دیکھنے کی آرزو ہی رہی۔ غواظ کی ڈیری جدید مشینوں سے آراستہ اور سفید ٹائل کی بنی ہوئی تھی، جس میں کہیں ایک دھبہ بھی نہ تھا۔ ڈیڑھ سو سے اوپر مویشی تھے۔ میں نے انھیں ہولسٹائن نسل کے سمجھا مگر سکریٹری نے بتایا کہ وہ سب فلسطینی نسل کے ہیں۔ دودھ کا سالانہ اوسط فی گائے ننانوے ہزار پونڈ تھا۔ دودھ بھی مشین سے دوا جاتا ہے۔ اتنی چھوٹی سی آبادی نے ایک برون خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ حفظانِ صحت کے اصول اور ریفریجریٹر مسلم ملکوں میں اہم مسئلے سمجھے جاتے ہیں مگر غواظ میں بالکل معمولی باتیں ہیں۔ مختلف مشینوں کی مرمت کے لئے گاؤں کا لوہار ناقص تھا اور تلِ عقیق سے مستری بلانا طول اٹل تھا اس لئے اس آبادی نے ایک ورکشاپ بھی قائم کر لیا ہے جو صرف مرمت اور پیرزے ہی بنانے کا کام نہیں کرتی بلکہ پوری مشین بنالیتی ہے۔ گھریلو دستکاریوں کو درست دینے میں اس ورکشاپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہاں لوہے کی ڈھلائی کا کارخانہ بھی چل رہا ہے ایک فیکٹری فرنیچر اور دوسرے لکڑی کے کام کے لئے جاری ہے اور ایک اور حشرات الارض مارنے والی دوائیں طیار کرتی ہے۔ مشین ہی سے کپڑے دسلتے، روٹی پکتی، کپڑے سستے اور جوتوں کی مرمت ہوتی ہے۔ عمارتیں بنانے والا ادارہ الگ قائم ہے اور پہاڑی کی چوٹی پر ایک ویجیٹرین ہوٹل اور گاؤں والوں کی راحت گاہ ہے جہاں ایک سو بیس آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔ پھلوں کو محفوظ کرنے کی ایک اور فیکٹری چل رہی ہے اور اس کا مال بیشتر انگلستان کو جاتا ہے۔ میں نے سکریٹری سے ایک مشین کے بارے میں پوچھا کہ کس کام کی ہے تو اس نے بتایا کہ :

”ایسینشیل آئل نکالتی ہے اور ہم نے خود ہی بنائی ہے۔ اب اس کی بہت مانگ ہے۔“

مزدوروں کا بیکار وقت گھریلو دستکاریوں میں صرف ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی وقت بیکار نہیں بیٹھتا۔ میں نے سکریٹری سے پوچھا کہ گزشتہ سال پورے گاؤں کی کل آمدنی کیا تھی تو اس نے بتایا :-

”۱۰ لاکھ میں ہماری کل آمدنی چار لاکھ پونڈ تھی۔ اس میں ایک لاکھ کاشت کا منافع تھا

اور تین لاکھ گھریلو انڈسٹری کا۔

یعنی کام کرنے والے ہر آدمی نے دو ہزار چھ سو امریکن ڈالر کمائے۔ مشرق وسطیٰ میں یہ اوسط آمدنی بہت بڑی دولت ہے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ ہر آدمی کو نقد کتنا ملتا ہے تو اس نے کہا کچھ نہیں یا برائے نام۔

میں نے پوچھا: ”فرض کرو وہ کوئی کتاب ہی خریدنا چاہتا ہے؟“
انے جواب دیا کہ: ”کتاب کے لئے وہ لائبریری کو اطلاع دیدیگا اور کتاب آجائے گی۔“
میں نے پوچھا: ”اچھا اگر کوئی فرد جو ان چاہتا ہے کہ اپنی کسی دوست لڑکی کو تفریح کرانے لے جائے؟“
جواب ملا کہ: ”اس صورت میں وہ خزا پنچ کے پاس جائے گا اور اسے مناسب رقم ملجائے گی لیکن وہ اگر اپنی بہن کو تفریح کرانا چاہتا ہے تو رقم کم ہو جائے گی۔“

یہودی قوم کی اس کو اپریٹو کاشتکاری کی کامیابی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن آج تو ذرا عتی اور سماجک طریقے برتنے میں یہ کامیابیاں اپنا ثانی کہیں نہیں رکھتیں۔

جن لوگوں نے یہ سماجی انقلاب کر دکھایا ہے وہ بلاشبہ طالسٹائی، روسو اور کروٹکین کے فلسفے سے متاثر تھے لیکن ان کی مشقت و جانمکاحی دراصل حالات کے تقاضے کا نتیجہ تھی۔ ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ فلسطین کی پہلی مشترک کھیتی اور سوشلسٹ سماج ۱۹۰۹ء میں دغانیہ بستی آباد کرنے سے شروع ہوئی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ غواط میں اگر انفرادی کاشت کا طریقہ جاری ہوتا تو موجودہ صورت کا غواط کبھی وجود میں نہ آتا۔

اس بستی میں ہر میاں بیوی کے لئے ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے کا مکان ہے۔ باورچی خانہ نہیں ہے کیونکہ سارے گاؤں کا کھانا ایک جگہ پکتا اور ایک جگہ کھایا جاتا ہے۔ بچے، بچوں کے گاؤں میں رہتے ہیں۔ شام کو جب والدین اپنے اپنے کاموں سے فرصت پاتے ہیں تو بچے گھر آکر ان سے ملجاتے ہیں۔ چھٹی کا دن بھی بچے والدین کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ماں باپ اگر سیر تفریح کے لئے تل عقیف جاتے تو بچوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ سال میں ماں باپ کو دو ہفتے کی چھٹی ملتی ہے، بچے ان چھٹیوں میں کبھی ماں باپ کے ساتھ جاتے بھی ہیں اور کبھی نہیں جاتے۔

بچہ پیدا ہونے کے چھ ہفتے بعد تک زچہ اسپتال میں رکھی جاتی ہے اور پھر چھ مہینے تک آدھے دن

کام لیا جاتا ہے۔ باقی آدھے دن وہ نرسری میں اپنے اور دوسرے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے چھ مہینے کا ہو جانے کے بعد بچہ نرسری سے بچوں کے گاؤں بھیجا جاتا ہے۔ بچوں کی غذا، صحت، کھیل کو وغیرہ پر سخت توجہ دی جاتی ہے۔ غواظ میں بچوں کی اموات کا اوسط چھبیس فی ہزار ہے جو دنیا میں سب ملکوں سے کم ہے، خود پورے فلسطین کا اوسط چوالیس فی ہزار ہے۔ غواظ کا طبی انتظام بھی اپنا ہے، اسپتال میں پندرہ بڑے اور تیرہ بچوں کے بلنگ ہیں۔

غواظ میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے۔ ثانوی تعلیم کو ناقابل ترک سمجھا جاتا ہے۔ مگر چودہ سال کی عمر ہونے پر لڑکے لڑکیاں کھیت یا فیکٹری میں بھی کچھ وقت صرف کرتے اور سیکھتے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر ہونے پر لڑکا یا لڑکی خود طے کرتے ہیں کہ ان کو وہاں رہنا ہے یا کہیں اور۔ ماں باپ مشورہ دے سکتے ہیں مگر جبر نہیں کر سکتے، جا کر پھر آ جانا ممنوع نہیں ہے۔ نئے آنے والے کو ایک سال تک جانچا جاتا ہے کہ وہ مشترک زندگی کے لئے بنا بھی ہے یا نہیں اور اگر وہ موزوں سمجھا جاتا ہے تو گاؤں سماج کا ممبر بنا لیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی جانچ اس بات کی کی جاتی ہے کہ نئے ممبر میں ”سمجھوتہ“ کرنے کی اسپرٹ ہے یا نہیں۔

سکریٹری نے بتایا کہ :-

”یہ نظام ہماری زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کر دیتا ہے۔ ہمارا مستقبل محفوظ اور یقینی

ہے، رہنے کو مکان ہے، کھانے کو ہر چیز ہے، پہننے کو کپڑے ہیں اور جوتا، بچوں کی تربیت،

تعلیم اور معالج کی ہمیں فکر نہیں، اور بے روزگاری کا اندیشہ نہیں اور چونکہ ہمارے کاندھوں

سے سارا بوجھ اتار لیا ہے، ہمارے پاس کلچری مشاغل کے لئے بھی وقت رہتا ہے“

ایک دوسرے منتظم نے کہا کہ :-

”ہم عمارتوں وغیرہ پر جتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی مناسبت سے ہماری آمدنی بڑھتی

اور کلچری معیار اونچا ہوتا ہے“

یقیناً غواظ کے لوگوں کا کلچری معیار دنیا بھر کے دیہات سے بہت اونچا ہے۔ بارہ سو پچاس آدمیوں

کی بستی کے لئے ایک لائبریری ہے جس میں بیس ہزار کتابیں ہیں، لائبریری کی عمارت میں بڑوں اور بچوں

کے مطالعے کے چھ کمرے ہیں، جن میں اخبار اور رسالے بھی رکھے رہتے ہیں۔ ہال میں چھ سو آدمی بیٹھ

سکتے ہیں جس میں ایک اسٹیج بھی ہے۔ اور تل عقیف سے ڈراما کمپنی اکثر آتی رہتی ہے۔ ڈانس اکثر

ہوتے ہیں، خود گاؤں والوں نے چوبیس آدمی کا ایک ارکیسٹر قائم کر رکھا ہے۔ ایک گاؤں والے نے

مجھے فخر یہ کہا کہ ”ہمارے تو بوڑھے بھی رقص کے بغیر نہیں رہتے!“ اجتماعِ رقص کی بھی مشق کرائی جاتی ہے، بوڑھوں اور بچوں، سب کے لئے کھیلوں کا انتظام ہے۔ تیراکی بہت زیادہ مقبول ہے۔ الغرض غواط شہری و دیہی زندگی کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔

شادیوں کاؤل سے باہر بھی ہوتی ہیں۔ لڑکی شادی کر کے شوہر کے ساتھ چلی جاتی ہے اور لڑکے اپنی بیویوں کو غواط لے آتے ہیں۔

اس گاؤل کا سماجی نظام اس لئے کامیاب ہے کہ جمہوریت کے اصول پر پورا پورا عمل کیا جاتا ہے اس سوسائٹی پر اگر کسی کا تحکم ہے تو خود ان کا اپنا۔ ساری طاقت جنرل اسمبلی یا ٹاؤن میٹنگ کے ہاتھ میں ہے جو حسب ضرورت اجلاس کرتی رہتی ہے ہر سال ایک ایکٹری کمیٹی چن لیا جاتا ہے، وہ سال بھر کا پلان بنا کر پیش کرتا ہے اس پلان پر اسمبلی میں بحث ہو کر ترمیم و اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر اس کی تعمیل شروع ہو جاتی ہے۔ ہر کام کے لئے ایک کمیٹی بن جاتی ہے۔

اس نئے سماج میں جس موضوع پر مطلق توجہ نہیں دی جاتی وہ سیاست ہے۔ چونکہ تنظیم کسی سیاسی عقیدے کی تحت نہیں ہوتی بلکہ سماجی و اقتصادی بہبود ہی اس کا مقصد ہے، جسے وہ حاصل کر چکے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، کوئی کسی کے سیاسی خیالات میں مزاحم نہیں ہوتا۔ غیر ملکی اخبار نویسوں نے غواط کی اس زندگی کو شہد کے چھتے کی زندگی سے تشبیہ دی ہے جہاں انفرادی خواہش کا وجود نہیں ہے۔ اس کا جواب غواط کے ایک بوڑھے کے ان لفظوں میں سنئے۔

میں اگر دو چار ایکڑ زمین نجی طور پر کاشت کرتا ہوتا تو مجھے ڈراما دیکھنے یا آرکیٹرا سنئے

طلّ عقیف جانا پڑتا، مگر چونکہ میں مشترک سماج اور زراعت کا ممبر ہوں ڈراما کمپنی اور آرکیٹرا

میرے یہاں چلے آتے ہیں۔“

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سوشلسٹ نظام کا جس میں کامل طور پر امداد باہمی کے اصول پر کام ہوتا ہے ملک کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ظن و تخمین ہی سے دیا جاسکتا ہے میرا نچتہ خیال ہے کہ بستیاں بسانے میں اگر روپیہ کی افراط ہو تو یہ کامیابی ہرگز نہ ہوگی، غواط کی کامیابی لوگوں کی محنت مشقت کا نتیجہ ہے۔ غواط کی اسکیم تجربے کی حد سے باہر نکل چکی، اور محنت و قربانی کی منزل پر آچکی ہے۔ آج غواط جس منزل میں ہے وہاں پہنچ کر یہ سوال ہونے لگتا ہے کہ انسان صرف روٹی ہی کیلئے نہیں جیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے دلوں میں یہ آرزو بھی پیدا ہو گئی ہے کہ مکان بہتر ہو اس کی آرائش اچھی ہو، اپنا ریڈیو اور ریفریجریٹر ہو، وہ لوگوں کی دعوتیں کریں اور

خود دعوئوں میں جاییں ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی بہت سی خواہشیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس وقت میرے خیال کے مطابق تقسیم نقد کی ضرورت کا وقت ضرور آئے گا۔ میرے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فلسطینی لیڈروں نے غالباً یہی اندازہ کر کے ایک نئی قسم کے گاؤں بسانا شروع کر دیا ہے ایسے گاؤں میں کاشت تو مشترک محنت سے ہوتی ہے مگر حاصل افراد میں بٹ جاتا ہے تاکہ حسب منشاء و مرضی اسے خرچ کر سکیں۔

غواط سے تل عقیف پلٹے ہوئے میں سوچتا رہا کہ مقصود ایران اس اسکیم پر عمل کر کے کس قدر نفع اٹھا سکتے ہیں، ان ملکوں کا گسان اشتراکی محنت کو ہر چند پسند نہیں کرے گا مگر اسے اس کی کتنی شدید ضرورت ہے، مولشی کی نسل سدھارنے کی ضرورت ہے، اچھے بیجوں کے انتظام کی ضرورت ہے، کھیتی اور انسانوں کی بیماریوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے اور گھریلو دستکاریوں کے نفع کا پورا احساس کرنے کی ضرورت ہے !

ہمارے چند مطبوعات

علاقہ شبلی :-	خطاب چھ آنے	حب وطن دو آنے
سفر نامہ مصر روم و شام - دو روپیہ	عبداللہ الحق :-	سرس تنگ خدمت دو آنے
اسلامی مدارس چھ آنے	اساس التعليم تین روپے	عبدالماجد دریابادی :-
اسلامی حکومت پانچ آنے	اختر جو ناگڈھی :-	زود پشماں بارہ آنے
زیب النساء تین آنے	اسلامی کتب خانے چھ آنے	شوق قدوائی :-
امیر احمد علوی :-	حیات نظامی آٹھ آنے	عالم خیال بارہ آنے
تاریخ اندور ایک روپیہ	مہدی بھو مالی :-	قاسم وزہرا :- بارہ آنے و ایک روپیہ
سفر سعادت ایک روپیہ آٹھ آنے	انسان دس آنے	مرزا رسوا بی، اے :-
احد علی :-	رموز فطرت دو روپے	ثنوی امید و بیم چھ آنے
شباب لکھنؤ دو روپیہ آٹھ آنے	علامہ حالی :-	نوبہار دو آنے
مرقع اودھ بارہ آنے	دیوان حالی دو روپے	غلام اسیر بدایونی :-
نذر بودھا موسی :-	الناظر یک یکینی لکھنؤ	بہترین غزل گو چار آنے
انتخاب نقیب آٹھ آنے		سوامی دپانند کی لایف - ایک روپیہ

چودھواں باب

زمین کی حیات نو

یہ خیال عام ہے کہ شہری لوگ جسمانی مشقت پسند نہیں کرتے۔ اپنے پُرانے تجربے کی بناء پر میں بھی اسی خیال کا تھا۔ لیکن غواط برنیر کے تقریباً سارے باشندے شہروں کے رہنے والے تھے، فلسطین پہنچنے سے پہلے انھیں کدال سچاؤڑے کا فرق بھی شاید معلوم نہ ہو۔ لیکن بیس سال کی مدت میں انھیں لوگوں نے محنت کا معجزہ کر دکھایا۔ بظاہر غواط کی بستی ایک معما نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا ہے نہیں پڑھا لکھا آدمی اگر ارادہ کر کے دیہاتی زندگی اختیار کرے تو سائنسی طریقوں پر عمل کرنے میں اسے تکلف نہیں ہوگا اور اس کی ذہانت اسے ایک بہتر کاشتکار بنا سکتی ہے۔ چنانچہ غواط کے ان کاشتکاروں کے ایک ہاتھ میں کھریا اور دوسرے میں کتاب تھی۔ جس سرزمین پر وہ آپڑے تھے، قدرتا انھیں اس سے گہرا لگاؤ ہونا چاہئے۔ اپنی زندگیوں کو نیا جنم دینے کا عزم بھی ان کے اندر لازمی تھا۔ سائنس کے ماہرین کے مشورے انھیں حاصل تھے۔ باہر سے مالی امداد بھی ان کے دست رس میں تھی۔ یہ تمام باتیں انکا قیمتی سرمایہ تھیں۔ بایں ہمہ ان کے پاس اگر جدید ترین مشینیں نہ ہوتیں تو ان کی کامیابی اتنی مکمل نہ ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ان کے عرب ہمسائے خود تاریخ کے مجروح تھے اور ان کو کچھ سکھانا نہ سکتے تھے۔ دیسی مولشی ویسے ہی خراب حالت میں تھے۔ جیسی فلسطین کی زمین، دودھ کا سالانہ اوسط فی مولشی تقریباً ساڑھے پنزدہ سو پونڈ تھا (امریکہ کی گائے کا اوسط ساڑھے آٹھ ہزار پونڈ ہے اور ڈیری کا مالک ایسی گائے کو اپنے گلے سے نکال دیتا ہے جو سال میں ساڑھے تین سو پونڈ مکھن نہ دیتی ہو) فلسطین کے نوآبادکاروں کے لئے بھی کم دودھ والے مولشی بے کار تھے۔ شام و لبنان کے مولشی بہتر ضرور تھے مگر تجارتی نقطہ نظر سے وہ بھی کارآمد نہ ہو سکتے تھے۔ یورپ سے عمدہ نسل کے مولشی آسانی سے منگائے جاسکتے تھے مگر تبدیل آب و ہوا کی وجہ سے وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہو سکتے، ولندیزی گائے کچھ مناسب ثابت ہوئی

مگر کثیر تعداد میں لا کر بسائی نہ جاسکتی تھی۔ ان حالات میں یہودی سائنسدانوں کو طے کرنا پڑا کہ فلسطین کے لئے انھیں ایک مناسب مویشی پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ولندیزی سائنڈ اور شامی گائے سے جو نسل پیدا ہوئی وہ قابل اطمینان نکلی۔ اس کے دودھ کا اوسط نو ہزار پونڈ ہے اور اس وجہ سے فلسطین میں ڈیری کی صنعت نہایت کامیاب ہے۔ فلسطینی عرب بھی اگر اپنے مویشیوں کی نسل اسی طرح بنالیں تو بلاشبہ فلسطین میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔ دوران جنگ میں عربوں نے کچھ حوصلہ دکھایا اور نئی قسم کے مویشی فراہم کئے مگر بالآخر چھوڑ بیٹھے۔ بڑے مویشی کی طرح یہودی نو آباد کاروں نے بھیڑ بکری کی نسلیں بھی سدھاری ہیں۔ لیکن بکری جو نہ صرف کھیتی بلکہ جنگل کو بھی نقصان پہونچاتی ہے، مقبول نہیں ہوئی۔

ان یہودی نو آباد کاروں نے ترقی کی کوئی صورت نظر انداز نہیں ہونے دی۔ مرغی پالنے کے کام کو بھی بہت کامیاب بنالیا اور ڈیری فارم کی طرح یہ بھی بہت نفع بخش ثابت ہوا ہے۔

مویشی کی نسل کو بہتر بنانے کا کام اتنا مشکل نہیں تھا جتنا فلسطین کی زمین کو نئی زندگی دے کر زرخیز بنانا، زمین کی سطح صدیوں تک بارش سے دھل دھل کر طاقت کھوتی رہی اور قوی بنانے کی کسی صورت پر عمل ہوا نہیں اس لئے ہجر ہو کر رہ گئی۔ اس کے لئے عربوں کو ملزم بھی نہیں گردانا جاسکتا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے یہ ملک تباہ و برباد ہوتا رہا ہے۔ مغلوں کی یلغار نے بے شمار عرب کاشتکاروں کو خانہ بدوشی کی زندگی پر مجبور کر دیا اور زمینیں بے وارث پڑی رہیں۔ ترکوں نے چار سو برس حکومت کی مگر عرب کاشتکار کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ بلکہ آفندی (زمیندار) اس کا خون چوستا رہا۔ ترکی حکومت کے عاملوں نے بھی آراضی کی تباہی کے سارے اسباب پیدا کر دیے۔ ۱۹۰۹ء میں ٹی اسی لارنس نے عرب ملکوں کا سفر کیا اور ان ملکوں کی ہرادی دیکھ کر غور زور ہو گیا۔ لیکن یہودیوں کی نو آبادیاں دیکھ کر اسے نجات کی صورت دکھائی پڑی۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

”ان کی (یہودیوں کی) کامیابیاں لامحالہ عربوں کو بھی ایک دن اسی جگہ لے آئیں گی۔ اور اس وقت عرب دنیا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔ یہودیوں سے عربوں کو تکنیکی مدد مل سکتی ہے اور وہ اس طرح صنعتی یورپ سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان ملکوں کی ایک کنفڈریشن وجود میں آکر ایکروز ”ورلڈ پاور“ بن جائے۔“

ملیریا ایک عام وباء کی صورت رکھتا تھا۔ یہودی نو آباد کاروں نے آتے ہی دلدلوں کو خشک کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کام کو انجام دینے میں خود بھی ملیریا کا شکار ہوئے مگر سمجھتے تھے کہ اس بلا کو دفع کئے بغیر جینا محال ہوگا۔ چنانچہ یہ جنگ ساٹھ سال تک لڑی جاتی رہی۔ آج ایک آدھ علاقے کو چھوڑ کر باقی

تمام دلدلیں خشک کر کے طیریا کے مچھر کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں طیریا نے بائیس فیصدی آبادی کو متاثر کیا تھا اور سالانہ میں صرف دو فیصدی اس بخار میں مبتلا ہوئے۔

یہودیوں کو اس فتح سے جتنا فائدہ پہونچا اتنا ہی عربوں کو پہونچا۔ فلسطین کے کسان اب مصر، عراق اور ایران کے کسانوں کی طرح طیریا کا شکار نہیں ہوتے۔

دلدلیں خشک کر دینے سے یہی فائدہ نہیں ہوا کہ طیریا دفع ہو سکا بلکہ ایسا کرنے سے کافی بڑا رقبہ کاشت کے لئے دستیاب ہو گیا۔ چھوٹے سے ملک میں سو لاکھ ایکڑ زمین کا اس طرح انجام بہت بڑی بات ہے جس علاقے میں دلدلیں ابھی تک خشک نہیں کی گئی ہیں وہ علاقہ ہے اور ان دلدلوں کا رقبہ اٹھارہ ہزار میل کا ہے۔ محلہ جھیل کا علاقہ اور شاداب ہے کیونکہ بارش کافی ہوتی ہے۔ اب اس جھیل میں مچھلیاں پرورش کرنے کی اسکیم جاری کی جانے والی ہے۔ اس علاقے کی آبادی پندرہ ہزار ہے جس میں پانچ ہزار یہودی اور دس ہزار عرب ہیں۔

فلسطین میں زمین سے متعلق سارے کام تقریباً انجام پا چکے ہیں۔ چٹانوں کو کھود کر نکال پھینک دیا گیا ہے ڈھلان مسطح کر دئے گئے ہیں۔ روخامہ کے علاقے کی زمین کو اب بارش کا پانی بہا کر نہیں لے جائے گا۔ کھار والی زمینوں کو پاک کر کے قابل زراعت بنا لیا گیا ہے۔

تمام زمینوں کو قابل زراعت بنانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ پانی کی تلاش بھی جاری تھی۔ ان نو آباد کاروں سے پہلے آبپاشی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ جھیلوں، ندیوں اور چشموں سے معقول کام لیا ہی نہ جاتا تھا۔ اٹھلے کنوؤں سے کچھ آبپاشی ہوتی تھی مگر زمین کی تپکا پانی ان میں سے بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ”یہودی نیشنل فنڈ“ نے پیایش کر کے بتایا کہ زیر زمین بہت کافی مقدار میں پانی موجود ہے، اور آسانی سے چار لاکھ ایکڑ کی زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک صرف سو لاکھ ایکڑ زمین پر آبپاشی ہوتی ہو اور ان زمینوں پر ایک سے زیادہ فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ بدل بدل کے فصل پیدا کرنا جدید دریافت ہے، فلسطین میں اس پر عمل کر کے زمین کی طاقت اور زرخیزی کو بڑھایا جا رہا ہے۔ نارنگی فلسطین کی پرانی پیداوار ہے مگر یہودی نو آباد کاروں سے پہلے نارنگی کی کاشت کے امکانات کا اندازہ نہیں کیا گیا تھا کہ چٹان میں سونا چھپا ہوا ہے۔

نارنگی کو فلسطین میں شہوتی کہتے ہیں، شکل اور ذائقہ دونوں طرح سے نہایت اچھا پھل ہے اور دنیا بھر میں اس کی مانگ ہو سکتی ہے۔ سالانہ میں ساڑھے سات ہزار ایکڑ پر نارنگی کی کاشت ہوتی تھی، ۱۹۳۵ء میں دس گنا تھی۔ عرب کے لوگ پھلوں کا ”گریڈنگ“ ان کا پیکنگ اور شبنگ نہیں جانتے تھے،

فلسطین کی زمین غلے کی کاشت کے لئے غیر موزوں ہے مگر یہودی کی طرح عرب کو بھی پیٹ تو بھرنے ہے لیکن وہ اس میں بھی ترقی نہیں کر سکتا کیونکہ نہ تو گہرا ہل چلاتا ہے نہ اچھا بیج میسر ہے اور نہ کھاد دے سکتا ہو۔ چونکہ یہودی کاشتکار کے ذہن و دماغ پر قدیم روایات کا بوجھ نہ تھا، وہ وسیع پیمانے پر مشینوں کا استعمال کر کے، بدل بدل کر فصلیں پیدا کر کے، عمدہ بیج ڈال کر اور کھاد کے استعمال سے چھوٹے سے رقبے میں زیادہ پیداوار کر لیتا ہے۔ ان دونوں میں فرق ظاہر ہے، ایک لکڑی کا دقیا نویسی ہل چلاتا ہے — دوسرا فولادی ہل استعمال کرتا ہے، ایک ہیل سے کام لیتا ہے، دوسرا ٹریکٹر سے!

عہد تورات و انجیل میں فلسطین کی سر زمین پر شہد کی نہریں بہتی تھیں مگر درمیان کی صدیوں میں اس کے سوتے سوکتے گئے، آج اس زمانے کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے، ~~۱۹۴۷ء~~ میں یہودی کاشتکاروں نے چھبیس ہزار چھتے پال کر ساڑھے بارہ لاکھ پونڈ شہد پیدا کیا تھا۔

قوم اسرائیل نے تہیہ کر لیا ہے کہ سر زمین فلسطین کے ہر ذریعے کو ترقی دیکر پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اسی مقصد سے اب وہاں مچھلی کی پیداوار بھی بڑھائی جا رہی ہے۔ جیلی کے سمندر میں ~~۱۹۴۷ء~~ سے مچھلیوں کی پرورش شروع ہوئی، مگر اب بحر روم سے بھی مچھلی پکڑی جا رہی ہے۔ اندرون ملک کی مچھلیاں بھی مچھلیاں پرورش پا رہی ہیں۔

ایک نسل کی مدت میں یہودی ہا جرین نے ارض مقدس کو پورے مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ زرخیز علاقہ بنا دیا ہے، بنجر زمینوں سے دو دو تین تین فصلیں لے رہے ہیں۔ زمین کو یہ نئی زندگی اس وقت ملی ہے جب ان نو آبادکاروں نے اپنی جانیں کھپا دی ہیں، وہاؤں سے جنگ کرنے میں جانوں کی قربانیاں دی ہیں۔

عربوں اور یہودیوں میں کیسی بھی عداوت ہو مگر یہودی نو آبادکاروں کا زوں کا یہ کارنامہ ایک تاریخی حقیقت ہے، مشرق وسطیٰ میں ان لوگوں نے تاریخ کو پلٹ دیا ہے! ان کے اس کارنامہ سے عربوں کو بھی فائدہ پہونچا ہے۔ اور جو کارنامہ انھوں نے فلسطین میں کر دکھایا ہے، وہی عراق، سعودی عرب، ایران اور مصر میں بھی دکھایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ کوئی طاقت رونما ہو کر مسلمانوں کی کاہلی اور جہالت کی دیوار کو ڈھادے اور مسلم فلاح کی تخلیقی قوت برسر عمل ہو جائے!

میں عرب طلبہ سے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں تلا ہوں، میں نے مسلم ملکوں میں سیاحت کر کے عرب نوجوانوں کی باتیں سنی ہیں اور ان کے ولولے اور آرزوں سے متاثر ہوا ہوں۔ عرب طالب علم غیر ملکوں سے خارج التحصیل ہو کر جب اپنے وطن پہونچیں تو ان کو ”درکان نمک“ ہو جانے سے بچانے کی ضرورت ہے

جو نوجوان علم و فن کی آرزو رکھتے ہیں ان کو حصول فن کے لئے غیر ملکوں میں بھیجنے کی ضرورت ہے، اور جو امریکہ یا یورپ نہیں جاسکتے انھیں فلسطین بھیجا جاسکتا ہے جہاں سے واپسی پر یہ نوجوان اپنے ملکوں کو فلسطین کی طرح شاداب و زرخیز بنا سکیں گے، اپنے عوام کی تخلیقی قوتوں کو ہمیز دے سکیں گے۔ عرب ملکوں کی نئی نسل کے لئے بہترین تعلیم و تجربہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے، وہ وہاں نظریاتی اور عملی طور پر سائنسی طریقوں سے زمین کو زرخیز بنانا سیکھ سکیں گے۔ فلسطین کی امداد باہمی کے اصول پر بنی ہوئی بستیاں یورپ کے تعلیم یافتہ یہودیوں کو اگر ماہر کاشتکار بنا سکتی ہیں تو عرب نوجوانوں کو بھی بنا سکتی ہیں۔

میں دقتوں سے بے خبر نہیں ہوں، اس میں عملی مشکلیں ہیں، کلچری رکاوٹیں ہیں، اور ڈپلومیٹک دشواریاں ہیں۔ لیکن یہ دشواریاں دور ہو سکتی ہیں بشرطیکہ دونوں طرف کے لیڈر انھیں دور کرنے کا ارادہ کر لیں۔ ان دشواریوں کو دور کرنے میں غیر ملکی ڈپلومیٹ اگر یہود و عرب کی عداوت کو بڑھانے کے بدلے اُسے کم کرنے میں لگ جائیں تو فلسطین میں مسلم نوجوانوں کو تعلیم کی بڑی آسانیاں مل سکتی ہیں۔ اور تمام مسلم ممالک کی اقتصادی و معاشی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں۔

یہود و عرب کی باہمی کشاکش کے متعلق برطانوی ریل کمیشن کی رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس غور و توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے:-

- (۱) ”فلسطین میں یہودی سرمائے کی درآمد نے پورے ملک کی بحالی پر اثر ڈالا ہے۔“
- (۲) عربوں کی سٹرس پیداوار میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی اس کا باعث یہودی سرمایہ کی درآمد ہے۔
- (۳) یہودی کاشت کی ترقی عرب کاشت کو اور خاص کر سٹرس کی کاشت کو ہمیز دے رہی ہے
- (۴) یہودیوں کی صنعتی و زرعی ترقی نے بہت سے عرب مزدوروں کو روزگار فراہم کیا اور شہروں بالخصوص بندرگاہوں کی ترقی کا باعث ہوئی۔
- (۵) بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور بیماریوں کو دفع کرنے میں کامیاب ہو کر یہودی نوآبادکاروں نے عربوں کو بھی فائدہ پہنچایا ہے۔

- (۶) ”نیشنل (یہودی) ہوم“ کے فنڈ نے رفاه عام کے لئے جو ادارے قائم کئے ان اداروں نے عرب آبادی کی بھی اتنی ہی خدمت کی جتنی یہودیوں کی۔ حداسہ کے اسپتال میں عرب مریضوں کا علاج بھی پوری دیانت کے ساتھ ہوتا ہے، صفاد کے دق کے اسپتال میں اور ریڈیولاجی انسٹی ٹیوٹ میں عرب مریض بھی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ دیہاتی بیماروں

پندرہواں باب

(لشکروں کا لشکر)

تل عقیف پہنچنے سے پہلے ہستادروت کا نام میں نے سنا بھی نہ تھا۔ یہ نام ہے (فلسطین کی یہودی ٹریڈ یونین) کا۔ لیکن یہ ایک ایسی جماعت کا نام ہے کہ تل عقیف پہنچ کر ناممکن ہے کہ کوئی اس سے بچر رہے۔ اس سے بے خبر رہنا گویا بھر روم کے وجود سے بے خبر رہنا ہے۔ میں جہاں جاتا تھا ہستادروت کی علامتیں اس طرح سامنے آتی تھیں جیسے بھر روم کی لہریں۔

مزدور تنظیم کی یہ نوعیت دیکھنا کیا تصور میں آنے والی بات بھی نہ تھی۔ اس مزدور تنظیم نے اپنے سر جس قدر ذمہ داریاں لی ہیں اور جو تخلیقی اسپرٹ دکھائی ہے اور اس اسپرٹ کا جو کامیاب عمل ہوا ہے اس کی مثال کہیں دنیا میں نہیں ملتی۔

یہ جماعت جس کا نام ہستادروت ہے مزدور جماعت بھی ہے اور سرمایہ داری ادارہ بھی۔ یہ کوقت دونوں کی نمائندہ ہے۔ وہ فلسطین میں سب سے زیادہ مزدوروں سے کام لینے والا کارخانہ دار ہے مگر مزدور مفاد کا محافظ بھی ہے۔ اس ادارے کی بہت سی فیکٹریاں اور کارخانے چل رہے ہیں اور تجارت و صنعت کی ترقی کے خیال سے بہت سی فیکٹریوں اور ملوں میں حصہ دار بھی ہے۔ دوسرے کارخانہ داروں سے تعاون کر کے ہستادروت نے شہر ہیرشیا کی تعلیم کے لئے ایک فنڈ اکٹھا کر لیا ہے جہاں دس ہزار کی آبادی ہے۔ سنٹرل ٹریڈ اینڈ انوسٹمنٹ کمپنی کی شرکت میں، ہستادروت نے حیدر کے اندر ایک سیمینٹ فیکٹری قائم کی ہے۔ فنی شن کالج کا کارخانہ فیل ہو چکا تھا، ہستادروت نے اس کے مالک سے خرید لیا اور مزید سرمایہ لگا کر اسے بالکل جدید سائنسی طریقے پر چلایا۔ آج شیشے کی چادریں بنانے کا یہ بہترین کارخانہ ہے۔ تعمیرات کا کام بھی بہت بڑے پیمانے پر جاری ہے اور مشینوں سے جوتا، اینٹ، صابن، تیل اور کاسمیٹک وغیرہ بنانے کی فیکٹریاں بھی کام کر رہی ہیں۔

ہستادروت، نجی ملکیت کے حق میں بھی ہے وہ پیداوار بڑھاتا ہے تو اس کی تقسیم بھی صحیح کرتا ہے، خدمت کرتا ہے تو جذبہ مسابقت بھی پیدا کرتا ہے، وہ عام تاجروں کی طرح اپنے حریف تاجر کو نقصان بھی پہنچا دیتا ہے اور اسے کمزور کر کے نکل بھی جاتا ہے۔ اس نے کارخانہ دار اور تاجر کی حیثیت سے جو وقار و رسوخ حاصل کیا ہے وہ حقیقتاً تجارتی فراست اور ہوش مندی کا بہترین مظاہرہ ہی سامان طیار کرنے اور اس کی تقسیم کرنے والے کی حیثیت سے ہستادروت کی طاقت بے حد بڑھ گئی ہے، اسی وجہ سے اس کے حرکت و عمل کی بھی حد نہیں رہی ہے۔ وہ مہاجن اور بینکر بھی ہے اور بچت کرا کے ڈیپازٹ کرنے اور قرضے دینے کی متعدد سوسائٹیاں بھی اس نے جاری کر رکھی ہیں۔ اس کے کئی چھاپے خانے بھی ہیں اور اسکے متعدد اخبار، رسالے اور پمفلٹ بھی ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لئے، لڑکوں کے لئے اور بالغوں کے لئے اسکول کھول رکھے ہیں، تکنیکی تعلیم کا بھی انسٹیٹیوٹ جاری ہے۔ تل عقیف میں اس کا اپنا سٹیٹسٹر ہے جہاں ہر قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ وہ اسپورٹس (کھیل) کی بھی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ”یہود ایجنسی“ کے تعاون سے اس نے ایک ٹریننگ اسکول جہازیوں کی تعلیم کے لئے کھول رکھا ہے۔ دوسرا ہوا بازی کا اسکول چلا رہی ہے۔ ایک کارخانہ جہاز بنانے اور مرمت کرنے کا بھی چلا رہی ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لئے اس نے چھوٹے چھوٹے جہاز خود بنوائے ہیں۔ کاشت کی مشینیں بنانے، چمڑہ رنگنے، ربڑ کا سامان طیار کرنے اور کپڑے کی انڈسٹری میں اسے خاص امتیاز حاصل ہے۔ چوری، آگ، زلزلہ، زندگی اور حادثہ وغیرہ کا بیمہ بھی کرتا ہے۔ فلسطین کے بائیس فیصدی مزدور، ہستادروت کے کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ فلسطین میں جتنا سا کام تجارت بتاتا ہے اس کا پانچواں حصہ ہستادروت کی فیکٹریوں کا بنا ہوتا ہے۔

دنیا کے اور ملکوں میں بدیسی مزدوروں کے داخلے پر پابندیاں ہیں، مزدور تحریکیں اس کی مخالفت کرتی ہیں، مگر یہ مزدور تنظیم ایسی ہے جو نئے آنے والوں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ نئے مزدوروں کے فلسطین میں آنے سے نہ تو وہاں کے پرانے مزدوروں کی شرح مزدوری میں کمی آتی ہے، نہ ان کی اجتماعی طاقت میں کمزوری ہوتی ہے نہ بیروزگاری پھیلتی ہے۔

دنیا بھر کی ٹریڈ یونینیں کیونزیم کی طاقت ہیں اور اس طرح طبقاتی جنگ پھیلتی بڑھتی ہے مگر ہستادروت ایک ایسی مزدور تنظیم ہے جو کیونزیم کی موت ہے! ہستادروت کے سب سے بڑے اور زیادہ لکھنے والے اخبار کا موٹو ”آزادی خیال و اتحاد عمل“ ہے۔ اس طرح تنظیم مغربی ملکوں کی مزدور تحریکوں سے بھی مختلف ہے ہستادروت اپنے مقصد و مدعا کے تحت اپنی ذمہ داری بڑھانے سے گھبراتا نہیں، اسی طرح وہ اپنے ممبر بڑھانے میں بھی حوصلہ مند ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ”تمام لوگ اپنی محنت کی کمائی سے پورا فائدہ اٹھائیں

اور کوئی شخص دوسرے کی محنت سے فائدہ اٹھانے نہ پائے۔“
اسی لئے ہستادروت کی ممبری سب کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ ہات پاؤں کے مزدور، پولس مین، کسان،
کلاڑی، ڈاکٹر، وکیل اور صنایع سب اس کے ممبر ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ البتہ جو کسان مزدور لگا کر کاشت کرتا
ہے وہ اس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

یہ ادارہ سلسلے میں قائم ہوا اس وقت اس کے ممبر ساڑھے چار ہزار سے بھی کم تھے مگر بڑھتے بڑھتے
آج پورے دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے اس کے ممبروں کے اعداد شمار یہ ہیں:-

اپنی زمین پر کاشت کرنے والے ۲۴ فیصدی

کھیت مزدور ۳

ٹیمپر، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ ۶

پولس مین ۳

یہ ایسے مختلف و متضاد پیشے کے لوگوں کا اجتماع ہے کہ اس کو نہ پروتاریہ جماعت کہا جاسکتا ہے نہ درمیانی
طبقے کا ادارہ۔ وہ ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ الغرض ہستادروت سب کچھ ہے، بینکر ہے، سلیس مین ہے، اکسپورٹر
و امپورٹر ہے، تھوک فروش، خوردہ فروش ہے، سرمایہ دار و مزدور ہے، اس کی حرکت و عمل کا دائرہ سرچکرا
دیتا ہے اور اس کی طاقت اور شوکت کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

فلسطین میں حالات کچھ ایسے عجیب و غریب تھے کہ ہستادروت کے وجود میں آئے بغیر کام بھی نہ چلتا۔
یہی وجہ ہے کہ مزدور تنظیم ہونے کے باوجود ہستادروت دنیا کے اور تمام مزدور اداروں سے مختلف ہے
اس تنظیم کا کام مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دینا ہی نہ تھا، اس کا مقصد یہودی شخصیت کو
نئے سانچے میں ڈھالنا بھی تھا۔ یہودیوں میں وہ اوصاف پیدا کرنا تھا جو دو ہزار سال کی آوارہ گردی میں وہ
کھو چکے تھے۔ ہستادروت کے ساتھ دوسرے یہودی اداروں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اس ادارے کے ایک ذمہ دار
آدمی سے میں نے سوال کیا کہ کیا وہ ایک فقرے میں ہستادروت کے مقاصد بیان کر سکتا ہے تو اس نے اقرار
کیا اور بتایا:-

یہودیوں میں فلسطینیت *Palestinization* پیدا کرنا۔

اس کا یہ لفظ میرے لئے ویسا ہی ناقابل فہم تھا جیسا لفظ ہستادروت۔ میرے لئے یہ اصطلاح *TU D I S M* اور
z i o n i s m سے زیادہ دلچسپ تھی۔

فلسطین میں متعدد یہودی ادارے کام کر رہے ہیں جن کا مقصد مدعا ایک نئی قومی تعمیر ہستادروت

بھی اسی مقصد کے لئے وقت ہے، مگر اس کا دائرہ عمل وسیع ہے اس کے کارگزاروں نے سمجھ لیا ہے کہ مختلف ملکوں کے یہودیوں کو فلسطین میں پناہ دینا اور بسا دینا کافی ہوگا بلکہ خطرناک بھی ہوگا! یہ نیا یہودی سماج اگر درمیانی طبقے کے لوگوں سے بنتا ہے جس میں دوکاندار، وکیل اور دوسرے پیشوں کے آدمی ہوں تو یہودی وطن (HOMELAND) کا توہین ہوگا۔ ہتادروت اس لئے یہودی قوم کے اندر سے GHETTO ذہنیت کو فنا کر دینا چاہتا ہے، اس سماجی تنفر اور گھمنڈ کو مٹا دینا چاہتا ہے جو مختلف ملکوں کے یہودیوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کا منشاء و مقصد یہ ہے کہ اس قوم کے اندر فطرت اور آفاقی سے وہی لگن پیدا ہو جائے جو ان کے آباء و اجداد میں اس وقت تک پائی جاتی تھی جب فلسطین کے تاجستان آباد تھے اور زراعت شاداب تھی۔ آرولن، ڈبوڈ، گارڈن یہودی احمیائے ثانی کا بڑا مبلغ تھا، لکھتا ہے:-

”وہ قوم جو فطری یعنی خود شعوری، خود کمتفی زندگی کے علاوہ کسی دوسرے قسم کی زندگی کی مادی پہچکی ہے، ایسی قوم کبھی جفاکش نہیں بن سکتی تاوقتیکہ وہ اپنے ارادے اور عزم کو اسی مقصد کے لئے وقف نہ کر دے! محنت و مشقت محض سبب نہیں ہے جو انسان اور زمین کے درمیان رابطہ اور حق قائم کرتا ہے بلکہ وہ سب سے بڑی قوت ہے جو ایک تمدن ڈھالنے کے لئے درکار ہوتی ہے، محنت انسانی مستقبل کے لئے بذترین تصور اور عقیدہ ہے، ایسی عینیت ہے جیسے آفتاب کی معالج نوعیت!“

فلسطین کے مہاجر یہودی جس ملک کے بھی ہوں، جسمانی مشقت کو سماجی کمتری کی دلیل سمجھتے تھے، محنت کا لفظ سماجی تحقیر کا مفہوم ادا کرتا تھا۔ اس لئے ان کو محنت و مشقت کا اعزاز و مرتبہ سمجھانے کے لئے کمرہ تعلیم کی ضرورت تھی۔ کتاب و قلم ہی تنہا تہذیب و تمدن کی علامت نہیں، بلکہ گڈال، ہتوڑا، پھاؤڑا اور ہل بھی اسی طرح تہذیب و تمدن کے نشانات ہیں۔ یہ سارے مہاجر یہودی اگر دوکاندار، ڈاکٹر اور وکیل بن گئے اور کچھ زمیندار پیدا ہو گئے تو یہودی وطن کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ ہتادروت زمینداری کے ادارے کو سامنت شاہی کی علامت سمجھتا اور اس سے سخت بیزار ہے۔ وہ کہتے عرب مزدوروں پر یہودی کاشت کو منحصر کرنے کے سخت خلاف ہے اس کا مقصود ہے کہ یہودی اپنی زمینوں پر خود کاشت کریں۔ یہودی دوکاندار یہودی وکیل، یہودی پروفیسر، یہودی ڈاکٹر، یہودی کارخانہ دار، یہودی ماں باپ سب محنت پسند نبیائیں وہ فلسطین کو صنایع و سائنسداں تاجروں و مل مالک، کالک نہیں بلکہ مستریوں، مچھیروں، کسانوں، مزدوروں اور بوجھ اٹھانے والوں اور اینٹیں کھوپنے والوں کا ملک بنانا چاہتا ہے۔ لگاؤ کے ساتھ زمین پر محنت

کر کے اور ہر آگے اور پچھے والی چیز سے محبت کر کے اسے ایسا مقدس و معزز بنا دیا جائے جیسی وہ عہد قدیم میں تھی۔ ہستادروت جٹلمین کسان پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ مسکین اور ادنیٰ کسان بنانا چاہتا ہے اور یہ کوئی انجیل کا اہام نہیں بلکہ وقت کی وہ فوری ضرورت ہے جو انجیل کے الفاظ کو نیا مفہوم دیتی ہے۔ ان وجوہ پر ہستادروت سمجھتا ہے کہ اس کا فرض یہی نہیں ہے کہ مزدوروں کی معمولی اور مادی مانگوں کی حمایت کر کے انہیں پورا کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ غیر مشقتی یہودی کو محنت کش بنادے۔ محنت سے محبت کرنا سکھائے۔ ہستادروت کا بہت سا لٹریچر جب میں نے مطالعہ کیا تو مجھ پر ”محنت کی فتح“ کا مفہوم واضح ہوا۔ اور میں سمجھا کہ ”فلسطینیت“ یہودیوں کے ذہن و مزاج کو کس طرح بدل رہی ہے۔

برطانیہ کی ابتدائی حکومت اٹھائیس سال فلسطین میں قائم رہی، اس مدت میں اگر وہ وہاں کی سماجی اصلاح مخلصانہ طور پر اتنی بھی کرنا چاہتی جتنی خود انگلینڈ میں کنسرڈیٹو حکومت نے کی تو ہستادروت ایسا زبردست ادارہ کبھی نہ بن سکتا جیسا کہ وہ آج ہے۔ برطانیہ کا سامراجی داغ فلسطین میں بھی اتنا ہی غیر جواب دہ تھا جتنا دوسرے مقبوضات میں۔ سماجی رجحانات سے متعلق اس نے ہر جگہ ویسی حکمرانوں کو کم سے کم زحمت دی اور محنت کش عوام کی کم سے کم مدد کی ہے۔ فلسطین میں ابتدائی حکومت نے جو ”لیبرل“ بنایا وہ کسی ایسے تحفظی قانون سے تو بہت بہتر تھا جس سے عرب مزدور واقف تھے مگر اس بدرجہا ادنیٰ تھا جو کنسرڈیٹو حکومت خود انگلستان میں جاری کر سکی تھی۔ اس حکومت نے ۱۹۲۵ء میں یہ حکم تو بلا تامل جاری کر دیا کہ دیا سلائی بنانے میں سفید فاسفورس استعمال نہ کیا جائے مگر عرب لوگ اپنی کم عمر بچیوں کو ادنیٰ قسم کی خدمت پر نوکر کرنے کے جو معاہدے کر کے کچھ رقم وصول کر لیا کرتے تھے اس رواج کو موقوف نہ کیا۔ بڑی اصلاح یہ کہ تھی کہ سال بھر سے زیادہ کا معاہدہ غیر قانونی ہوگا۔

ہستادروت نے اگر مزدور کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد نہ کی ہوتی تو فلسطین ہمیشہ سستی مزدوری کی منڈی بنا رہتا۔ اس نے ایک طرف مزدور کے حقوق قائم کرائے اور دوسری طرف ہا جسہ مزدوروں کو محنت پسند بنایا۔ اس طرح اس نے وہ ذمہ داریاں اپنے سر لیں جو حکومتوں کو لینا چاہئے تھیں اور فلسطین کی ابتدائی حکومت اسے پورا نہیں کر رہی تھی۔ مزدور کو پسند نصیبت کرنا بے نتیجہ ہے۔ اگر اسے یقین نہ دلایا جائے کہ اس کی محنت کا مناسب معاوضہ بھی ملے گا۔ اس نظریہ کے تحت ہستادروت نے رفاہ و اصلاح کا ایک ایسا پروگرام بنایا جو مغربی ملکوں میں بھی جاری نہ کیا جاسکا تھا۔ ہستادروت اپنے تمام مزدوروں کی جان، تندرستی، حادثہ، بیماری، ضعیفی اور بے روزگاری کا بیمہ کرتی ہے اور بیواؤں، یتیموں کو پیشکش بھی دیتی ہے۔ زچہ کی حفاظت اور بچے کی خبر گیری اس بچے کا خاص پہلو ہے۔ اس کا سب سے

مہتمم بالشان کام ”بیمار فنڈ“ ہے، جس کی شاخیں اور ادارے سارے فلسطین میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں جہاں یہودی کاشت کی نوآبادی ہے وہاں ہستادروت کا طبی امداد کا انتظام بھی ضرور ہے اس نے جو ادارے قائم کئے ہیں، ان کی تعداد ذیل میں درج ہے :-

۶	اسپتال
۲	بعد صحت آرام گاہیں
۸	مرکزی دوا خانے
۳۱۵	دیہاتی ڈسپنسریاں
۷	ایکس رے انسٹیٹیوٹ
۱	مرکزی فارماسیوٹیکل ڈپو
۱۶۱	فارمیسیاں
۲۷	دانت کے کلینک
۳۰	الکٹرو فیزیائی انسٹیٹیوٹ
۱	بچوں کی خبر گیری کا سینٹر ڈیپارٹمنٹ آف ہائی صین

ان تمام ممبروں کے علاوہ ہستادروت غیر ممبر عربوں کو بھی طبی امداد پہنچاتا ہے اور زچہ کی خبر گیری کا خاص انتظام ہے۔ اس کام کے لئے اس نے تمام کارخانہ داروں سے وہ جتنی مزدوری سال بھر میں ادا کرتے تھے اس کا تین فیصد وصول کیا اور اس کے لئے اپنے ممبروں سے سات ہلکے گیارہ فیصدی تک وصول کیا اور یہ سارے کام جاری کئے۔ اس فنڈ میں انتدابی حکومت اور دوسرے یہودی اداروں نے بھی چندہ دیا۔ بعض طبی اسکیموں میں عرب مزدور بھی شامل ہیں۔ عرب مزدوروں کو ہستادروت پوری طرح شامل کر لیتا مگر باہمی مفاد بڑا مانع تھا۔ اس لئے اس نے فلسطین لیبر لیگ قائم کرائی جس میں دونوں قوموں کے مزدور اپنی آزاد مزدور جماعتوں کو خود مختار رکھتے ہوئے بعض مفاد کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکیں۔ اس لیگ کا کام عربی و عبرانی دونوں زبانوں میں ہو سکتا تھا۔ اس لیگ کے پانچ ہزار سے زیادہ ممبر بنے اور سیاسی نزاکتوں کی بناء پر اپنا مقصد حاصل نہ کر سکی۔

دنیا بھر میں کوئی انسان طبی امداد سے اتنا محروم نہیں جتنا وہ عرب کسان جو شہروں سے فاصلے پر آباد ہے۔ ہستادروت کی طبی تنظیم ان عرب کسانوں کی خدمت کرتی ہے۔ دو ہزار پانچ سو سے کچھ زیادہ ڈاکٹر نوکر ہیں۔ ان میں دو سو سے اوپر عرب ہیں اور سوا سو غیر عرب عیسائی باقی سب یہودی ہیں۔ لیبر لیگ

اپنے عرب ممبروں کو طبی امداد پہنچاتی ہے۔ وسیع پیمانے پر طبی امداد کا انتظام ہستاد روت کی حرکت و عمل کا صرف ایک پہلو ہے، ورنہ اس کی خدمات مختلف نوعیت کی ہیں۔ جسمانی اور کلچری ترقی و بہبود کی خاطر متعدد تجارتی ادارے قائم ہیں۔ تعلیم گاہوں کے علاوہ کھیل کے میدان تھیٹر اور اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔

ہستاد روت کی امداد نہ ہوتی تو غواظ برنیر آباد نہ ہو سکتا اور آباد بھی ہو جاتا تو اتنا خوشحال و کامیاب نہ ہوتا۔

ہستاد روت کے مہاجنی ادارے سٹھوک اور خوردہ فروشی کی کوآپریٹو سوسائٹیاں اور فیکٹریاں سب نوآباد کاروں کی بحالی و ترقی کے لئے اور ہر وقت ان کی خدمت کے لئے آمادہ ہیں۔ فلسطینی ساخت کے اونٹن آلات۔ درآمد کی ہوئی مشینیں، فنی جرائد، ہوشیار مستری، کاشت کے ماہر، اور دوسری بہت سی چیزیں تو آباد کاروں کی خدمت کے لئے اسی طرح قابل حصول ہیں جس طرح طبی امداد۔ فلسطین میں دوسو کے قریب امداد باہمی اور چھوٹے کاشتکاری کے گاؤں ایسے ہیں جو ہستاد روت کی امداد کے بغیر آباد نہ ہو سکتے تھے۔

یہودی قوم میں مخصوص ذہن و دماغ کا کاشتکار طبقہ پیدا کر دینا اسی عظیم الشان ادارے کا کام تھا۔ اس کے تمام کام پہلے سے سوچے سمجھے پلان کے مطابق انجام پاتے ہیں اور ان اسکیموں اور پلانوں کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کاشتکار کاشت کو کامیاب بنانے کی فکر کے سوا ہر فکر سے آزاد ہو۔ چنانچہ اس ادارے کی مدد اور ہدایت کے بموجب نوجوان یہود مرد اور عورتوں کی ایک جماعت بحر مردہ کے ساحل پر پہنچی جہاں صدیوں سے کسی قسم کی روئیدگی کا وجود نہ تھا کیونکہ زمین میں تیزابی مادہ تھا، ان نوجوانوں نے بالآخر اس زمین کو کار آمد بنالیا اور وہاں بیت حاردہ کے نام سے ایک خوشحال گاؤں آباد ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کی جنگ میں وہ گاؤں عرب فوجوں نے پامال کر دیا۔

یہ ادارہ مسلسل و متواتر نئی زمینیں دستیاب کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اسے نفیث کے علاقہ پر توجہ کی۔ یہ علاقہ جنوبی فلسطین میں کوئی تیس لاکھ ایکڑ زمین کا ایک مثلث ٹکڑا ہے۔ پانی کی قلت تھی اور روئیدگی کا صرف ایک کنارے پر وجود تھا وہاں بدوی لوگ سیاہ ڈیرے جائے اپنے گلوں کو چراتے تھے اور اگر پانی برس جاتا تو گڑھوں میں پانی جمع کر کے کچھ کاشت بھی کر لیتے تھے۔ حالانکہ کسی وقت علاقہ ایک تمدن کا مرکز رہ چکا تھا۔ اس علاقے کو شاداب بنانے کے لئے ہستاد روت نے تین مہینے جدا جدا روانہ کیے تاکہ زمین، آب و ہوا اور پانی کی تلاش کر کے رپورٹ دیں۔ ۱۹۴۷ء تک اس علاقہ میں چودہ گاؤں آباد ہو گئے۔

اکیس اور آباد کرنے کی اسکیم تھی۔ ۱۹۴۸ء میں یہ علاقہ جنگ کا میدان بنا رہا۔

کاشت کی ترقی کے ساتھ ہستادروت نے گھریلو صنعتوں کو بڑھانے میں بھی بہت بڑا کام کیا ہے۔ مشکل سے کوئی کاشتکار آبادی ایسی ہوگی جہاں اچھے بڑے پیمانے پر گھریلو صنعتیں نہ چل رہی ہوں۔

امداد باہمی کے اصول پر پورے فلسطین میں عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہستادروت نے کسی سیاسی نظریے کو قبول نہیں کیا ہے۔ اور یہی بات اس کی طاقت و اثر کا راز ہے۔ من حیث المجموعت ہستادروت کا رجحان سوشلسٹ ہے لیکن وہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی چھٹی جنرل کنونشن ہوئی تو فلسطین کی کچھ سیاسی پارٹیوں میں سے دس پارٹیوں کے لوگ اس کنونشن میں شریک تھے۔ سرچند ہستادروت یا لیبر پارٹی اس ادارے میں اکثریت رکھتی ہے مگر ادارے کے کاموں میں سیاسی عقاید کا اختلاف کبھی عمل نہیں ہوا۔ یہ ادارہ سوشل ڈیموکریٹ سے بہت قریب ہے۔

روس کی حالیہ پالیسی نے کمیونسٹوں کو فلسطین میں نامقبول بنا دیا ہے، لیکن سخت اختلاف کے باوجود وہاں باہمی عناد نہیں پایا جاتا۔

ہستادروت کی بڑی خصوصیت اس کی کاروباری ذہنیت رکھنا اور اس کا عملی ہونا ہے۔ ممبروں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی مالی طاقت اور سماجی وقار اتنا بڑھا ہوا ہے کہ انتدابی حکومت کے زمانہ میں اسے ”ریاست کے اندر ریاست“ سے تعبیر کیا جاتا تھا، اور اس وقت یہ بات غلط بھی نہ تھی اس لئے کہ ہستادروت بہت سے ایسے کام کرتا ہے جو حکومت کو کرنے چاہئیں۔ اب چونکہ اسرائیلی ریاست قائم ہو گئی ہے۔ اس لئے ہستادروت اب بھی ریاست کے اندر ایک ریاست ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ اور وہ اس لئے کہ خود اسرائیل کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، ایک چھوٹی سی ریاست کے اندر کچھ مختلف عقاید کی سیاسی پارٹیاں کوئی نیک شگون نہیں کہا جاسکتا اسرائیل کے انتہا پسند جو انتدابی زمانے میں دہشت انگیزی پھیلاتے رہے، اب اکھنڈ فلسطین چاہتے ہیں۔ اور ان کی طاقت و اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خیال کے مطابق یہ جماعت یہودی قومی اتحاد کے لئے خطرہ ہے۔ کیونکہ اکھنڈ فلسطین کے تصور میں اگر اس جماعت کو کامیابی نہیں ہوئی تو وہ خود اسرائیل کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے جو اسرائیل کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں اس ذیل میں ہستادروت کا اثر و رسوخ ہی توازن کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

سولھواں باب

(بیداری یا تباہی)

بالآخر میں واپس سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا۔ جینوا کا موسم گندہ تھا مگر اس کی ستھرائی اور صفائی چمکتی معلوم ہوتی تھی، مشرق وسطیٰ کے شہروں کے مقابلہ میں جینوا ایک نئی چیز معلوم ہو رہا تھا۔ اسل میں یہاں تمدن اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے اور اینٹ پر اینٹ چن کر ایک ذیشان عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ جینوا میں قاہرہ کی سی شان و شوکت اور افلاس و امراض کی انتہا دونوں مفقود ہیں۔

خیالات کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جینوا بہت مناسب مقام ہے۔ میں نے اپنی یادداشتیں نکالیں اور وہ سب کتابیں بھی جو میں نے دوران سیاحت میں خریدی تھیں اور وہ لٹریچر بھی جو مجھے وزارت خارجہ کے دفتروں سے ملا تھا۔ میں ان سب پر غور کرنے لگا۔

جسوقت میں اپنی نوٹ بک کو پڑھ رہا تھا تو ان میں لطف و رافت، ترحم و ہمدردی کی تمام باتیں ڈپلومیٹ لوگوں کی منہ کی نہیں بلکہ مشنری پادریوں کی کہی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ولیم لیم اور ڈاکٹر ولیم شارب سے میری ملاقاتیں بھول جانے والی چیز نہ تھیں، یہ دونوں تصنع سے پاک اور اپنے حلقہ عمل کی ممتاز ہستیاں تھیں، ایران کے لوگوں سے ان کے تعلقات جس نوعیت کے تھے وہ بلاشبہ بڑے محرک و سبق آموز تھے۔ ڈپلومیسی اور پاور پالیٹکس سے یہ دونوں انسان بہت اونچے اور ارفع تھے۔ ان کا کام نوع انسان کی خدمت ہو ان پادریوں نے ایران میں سوال انسانیت کی اہمیت کا جیسا اندازہ کیا ہے کسی ڈپلومیٹ یا سائنس کے ماہر نے نہیں کیا ہے۔ ان پادریوں نے کوئی صل تو پیش نہیں کیا لیکن بہتری کی امید ضرور ظاہر کی ہے۔ بہتری کس طرف سے آئے گی؟ یہ نہ ان کو معلوم ہے نہ کسی اور کو۔

جو لٹریچر میں نے دوران سیاحت میں خریدا اس میں لاؤڈرملک کی کتاب PELASINE: LAND OF PROMISE بھی تھی۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو میرے

بدلنے کی ہے۔ جن بیماریوں کو آسانی سے دفع کیا جاسکتا ہے ان سے ہمیں لاکھ بھڑپیں ہر سال مر جاتی ہیں۔
حشرات الارض کھیتی کا تقریباً تین کروڑ ڈالر سالانہ کا نقصان کر دیتے ہیں۔ حالانکہ پانچ ڈالر فی کس سالانہ
کے خرچ سے تین سال میں ملیریا کو بالکل ختم کیا جاسکتا ہے، لیکن کوئی پروا نہیں کرتا۔

خیرتناک ماجرا ہے کہ جو ملک تیل کی پیداوار میں چوتھے نمبر پر ہو وہ قیمتی جنگل اور اس سے زیادہ
قیمتی کھاد کو ایندھن کی طرح جلا ڈالے! ایسی قوم کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے!

”مصر“ باغِ عالم“ کہلاتا ہے مگر تین چوتھائی آبادی جو دیہات میں رہتی ہے آنکھوں کے مرض کا اور
خارش و دوا کا شکار ہے۔

شام کی تیس لاکھ کی مردم شماری میں دو تہائی کاشت کرتی ہے مگر قابلِ زراعت آراضی کا ساٹھ فیصد
رقبہ ایسے زمینداروں کی ملکیت ہے جو دیہات کو جھانک کر بھی نہیں دیکھتے۔ شام میں ساڑھے بارہ لاکھ
ایکڑ پر کاشت کی جاسکتی ہے مگر زیر کاشت آراضی اس کا تیسرا حصہ ہے۔ کاشتکار آسانی سے دخل کیا
جاسکتا ہے، اس لئے وہ زمین پر محنت کیوں کرے؟

عراق پینتالیس لاکھ انسانوں کا ملک ہے۔ وہاں بھی قابل کاشت زمین پر صرف بیس فیصدی
زراعت ہوتی ہے۔ برطانوی سائنسدانوں نے عراق کی کاشت اور آہرسانی کو کافی ترقی دی ہے لیکن
کاشت چونکہ بٹائی پر ہوتی ہے اس لئے کوئی معقول فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔

سو سال کے قریب ہوئے جب روسی طنز نگار سالتی کوٹ شچیدرین نے روسی کسان کی ہر باد
حالت پر غصہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

”ہمارے کسان چمڑے کے بدلے کٹڑی کے جوتے کیوں پہنتے ہیں؟ گوشت کی غذا انکے لئے

ناممکن کیوں ہے؟ انھیں مکھن یا چربی کیوں میسر نہیں؟ وہ تقدیر پرست کیوں ہیں؟ اور

ان کا ضمیر کیوں مردہ ہو گیا ہے؟ وہ کیوں کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے اور کیوں کھیدوں کی طرح

مر جاتے ہیں؟“

یہی سوال عرب ملکوں میں دہاں کے فلاح کے متعلق دہرائے جاسکتے ہیں۔ روس میں زرعی غلامی رائج
رہی تو روس کو اس کی قیمت بدترین خونیں انقلاب سے دینا پڑی۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی موجودہ حالت
دیکھنے اور سمجھنے والا بھی کچھ اس طرح کا قیاس قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

میرے سامنے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے قوم پرست نہیں بلکہ وہاں کے فلاح ہیں۔ اس کی تندرستی کی
بحالی سب سے مقدم ہے، کیونکہ وہ موثر طریق پر فوج میں خدمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔

فلسطینی مصر کے میں عرب سپاہی بہترین اسلحہ کے باوجود مکمل شہرت ہوا، حالانکہ برطانوی کمانڈر کا دعویٰ تھا کہ عرب فوجیں دس دن کے اندر پورے فلسطین کو روند ڈالیں گی۔

ان ملکوں میں فوجی طاقت اس لئے مفقود ہے کہ تندرستی غائب ہے، انسانوں کا یہ جم غفیر ادنیٰ قسم کی خوشی سے بھی محروم ہے۔

ان ملکوں کا فلاح کاشتکار نہیں بلکہ کھیت مزدور ہے کیونکہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے۔ اور بے زمین فلاح کسان ایسا ہی ہے جیسے بغیر پانی کا پودا وہ عناصر فطرت کے قہر اور انسان کی حرص و طمع کا شکار ہے۔ وہ نہ ڈیما کریٹ ہے نہ سینیٹر، قانون بنانے میں اسے کوئی دخل نہیں مگر اس کی تعمیل پر مجبور ہے۔ وہ نہ خریدار ہے نہ تعمیر کرانے والا، کیونکہ اس کی کوئی

قوت خریداری نہیں ہے۔ اسی لئے وہ ملک کی صنعت و تجارت میں کسی قسم کی مدد نہیں پہنچا سکتا اور اس طرح قوم و ملک کے اقتصاد اور کلچر پر بار ہے۔ اس کی زندگی ایسی باتوں سے خالی ہے جو دلولہ پیدا کر سکیں جو اس کی قابلیتوں کو ہر سر عمل لاسکیں۔ فلاح نہ تو زندگی میں اپنے اولاد کو کچھ دے سکتا ہے اور نہ مرنے کے بعد کوئی ورثہ چھوڑتا ہے۔ سید ضیاء الدین سابق وزیر اعظم ایران کے الفاظ ہیں :-

”بھوکے انسان کا نہ خدا ہے نہ وطن!“ ان ملکوں میں عروج قوم پرستی نے وہاں کے فلاح کو کچھ نہیں دیا۔ روٹی کی بھوک آراضی کی بھوک کا نتیجہ ہے اور اس بھوک نے دنیا میں خونیں انقلاب کردئے ہیں۔ آئرلینڈ اور میکسیکو میں بار بار خون کی ندیاں بھی ہیں۔ چین آج بھی خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ جنوبی امریکہ کے ملکوں میں آج کل بھی انقلاب برپا ہوتے رہتے ہیں، انقلاب ہوتا ہے، ڈکٹیٹری قائم ہوتی ہے پھر انقلاب ہوتا ہے۔ یہ سارے انقلاب صرف اس لئے ہیں کہ زمین کو جو تنے والا زمین کا خود مالک نہیں ہے۔ اور جب تک ایسا ہے، خون بہتا رہے گا۔ میرا عقیدہ ہے کہ زار روس اگر زرعی غلامی کو ختم کرنے کا حکم جاری کر دیتا تو روس میں بولشویک انقلاب ہرگز برپا نہ ہوتا۔

جان برائنٹ ایک برطانوی لبرل نے سو سال پہلے لکھا تھا کہ :-

”قانون جب اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کر دے، حکومت جب عوام کے حقوق ادا کرنے میں

قاصر رہے، زمیندار جب آراضی کے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشتکاروں میں ضد اور مقابلہ پیدا کر کے

نفع اٹھائے، وہاں لوگ قانون سے سرگردانی کرنے لگتے ہیں، تہذیب و تمدن کے اصول ترک

ہو جاتے ہیں اور فطری بلکہ انتقامی قانون کام کرنے لگتا ہے!“

۱۹۲۹ء میں جو ناٹھن سوئٹفٹ نے آئرلینڈ کے متعلق لکھا تھا :-

”ایک تجزیہ ہے کہ زمین کے مالک اپنے کاشتکاروں پر کم سے کم یہ رحم ضرور کریں کہ ان کے بچوں کو لے لیا کریں۔ ان بچوں کا گوشت دس شلنگ کو ضرور ہک سکتا ہے، اس میں سے آٹھ شلنگ مال کو دیدیا کریں تاکہ دوسرے بچے ہونے تک وہ اس رقم سے اپنے آپ کو کام کے قابل رکھ سکے۔“

آج مشرق وسطیٰ کے زمیندار اس وقت کے آئرش مالکان زمین سے پیٹے نہیں ہیں۔۔ امریکہ اور ڈنمارک وغیرہ کی ترقیاں جہاں زمین اسکے جوتے بونے والے کو دیدی گئی ہے، اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں، اور وہاں بعض خرابیاں اسی وجہ سے نہیں ہیں کہ کسان اپنی زمین کا مالک ہے۔ فلسطین کے یہودیوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ زمین خراب ہونے کے باوجود اور کسان کی کمزوری کے ہوتے ہوئے بھی ان دونوں میں نئی جان ڈالی جاسکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ عرب فلاح کے مقابلہ میں یہودی کاشتکار کو صد ہا قسم کی سہولتیں حاصل ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے کاشت کو کامیاب بنانے کے سوا کوئی کام نہ تھا، ان کو عرب فلاح کی مصیبتیں برداشت نہیں کرنا پڑیں، نہ اسے باہمی مجاہدہ میں مبتلا ہونا پڑا نہ اپنے لیڈروں سے نئے طریقے اور اوزار استعمال کرنے کے لئے کشاکش کرنا پڑی۔ تاہم فلسطین کا یہودی اگر یہ سب کچھ نہ دکھاتا تو عرب و ایرانی لیڈروں اور غیر ملکی ڈپلومیٹ کو ایسے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ عربوں کو بتایا جاتا کہ ”اپنی مدد آپ“ کے معنی کیا ہو سکتے ہیں! یہودی عرب کی عداوت کیسی ہی شدید ہو، یہودی آبادکاروں کے کارنامے عرب کی نجات کا موجب بن سکتے ہیں۔

برٹش ڈپلومیسی نے مشرق وسطیٰ میں جس ناروا پالیسی پر عمل کیا وہ عربوں اور یہودیوں کی ہر نصیبی تو شمی ہی، برطانیہ اور دنیا کی شومی قسمت کا بھی ثبوت ہے۔ یہودی عرب آج ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ان کو دوست بنانے کے لئے عقل سلیمان درکار تھی مگر برطانیہ کے پورے ریکارڈ میں کسی ایک کوشش کا ثبوت بھی موجود نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب میونخ کی شطرنج کھیلی جا چکی اور چیمبرلین نے ”ہماری زندگیوں میں امن“ کا اعلان کیا تو میں اور دوسرے صحافی جو اس وقت پراگ میں موجود تھے اس ڈپلومیسی کو منطوق نہ سمجھ سکے لیکن جس پاور پالیٹکس نے برطانیہ کی فلسطینی پالیسی بنوائی وہ بھی میونخ کی طرح کوتاہ اندیشی کی پالیسی تھی۔ اسرائیل آج ایک خود مختار ریاست ہے، بیرونی دنیا کے اثرات اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس کا فرض یہ ہے کہ عرب دنیا کا اچھا پڑوسی بنے۔ اس یہودی ریاست کے سامنے اس سے زیادہ اہم اور تاریخی کام دوسرا نہیں ہو سکتا یہودی ریاست یہ نہیں کرتی ہے تو نہ وہ خود چین پائے گی نہ عرب دنیا کو چین ملے گا۔ اپنے وطن امریکہ واپس پہنچ کر میں نے وہ غیر معمولی تابناکی اور فراوانی دیکھی جیسی کسی ملک میں نہ دیکھی تھی۔ باتیں اونچی آوازوں میں کی جا رہی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں ہمارے قومی لیڈر دنیا کی جانچ کر رہے تھے، سائنسدان اسے ایٹمی بحران بتاتے ہیں سوشلسٹس کے ماہر کہتے ہیں کہ انسانی علم میں بحران آیا ہوا ہے۔ اقتصاد کے ماہر اسے اقتصادی بحران کہہ رہے ہیں، علم النفس کے ماہر کہتے ہیں کہ ایک عالمگیر اعصابی اختلال ہے، سیاسی مدبر اسے روس کے حملہ سے تعبیر کرتے ہیں، کمیونسٹوں کا خیال ہے کہ ان کے عقاید اور سرمایہ داری کے مابین ایک بین الاقوامی معرکہ ہے، فلسفی سمجھ رہے ہیں کہ کچھ نہیں بس خیال کے اندر بحران ہے، مذہبی پیشوا اسے ایمانی بحران سمجھتے ہیں، مگر ارضیات کے سمجھنے والے زمین اور آبادی کا بحران مانتے ہیں۔

ان تمام آوازوں میں سے یہ آخری پکار میرے لئے کشش رکھتی ہے۔ فیرفیلڈ آسپورن مصنف
OUR PLUNDERED PLANET اور ولیم دوگٹ ROAD TO SURVIVAL کی آوازوں
نے مجھے بہت مسحور کیا۔ یہ اور ایسے دوسرے لوگ پادری پائلیکس سے بہت بلند ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں کہ اگر زمین کی
گھٹتی ہوئی قوت کا علاج نہیں کیا گیا تو انسان کے مقدر پر مہر لگی سمجھو!

مغربی ملکوں کے کاشتکار نے ان ”پیغمبروں“ کی آواز پر دھیان دینا شروع کر دیا ہے، مگر فلسطین کو
چھوڑ کر مشرق وسطیٰ کے تمام زمیندار اور لیڈر ہنوز خواب خرگوش میں ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ زمین کی نجات کسان
کی مدد ہی سے ممکن ہے، اور کسان کی مدد اسی وقت حاصل ہوگی جب اس کا معیار زندگی اونچا ہوگا۔

ایں ہمہ دنیا کے سیاست دان اور مدبر ”روسی حملے“ کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ کمیونزم کے پھیلاؤ
کو روکنے کی تدبیروں میں لگے ہیں، ایشیا و افریقہ کی بغاوتوں پر دماغ سوزی کر رہے ہیں، تیل اور ہوائی اڈوں کے
جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں، فوجی ماہر جنگ کے نقشوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ طبقات الارض کے ماہر، اور انجینیر
اور بینکر اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں تیل کے ذخیروں کا حساب لگا رہے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن
ایک غریب فلاح ہے جسے کوئی نہیں پوچھتا، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں، حالانکہ یہ اٹھارھویں ائیسویں صدی
نہیں، بیسویں صدی ہے! ہوا بازی اور ایٹمی توانائی کی صدی ہے! ہوائی جہاز ہی نہیں پرواز خیال کی صدی
ہے! بغاوت کے خیالات کی پروانہ کی صدی ہے! وہ نہیں دیکھتے کہ دنیا کا کسان کسمسانے لگا ہے۔ حرکت میں
آ رہا ہے! وہ کارل مارکس کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن اس سے آراخی کی بات کی جائے تو فوراً سمجھ لیتا ہے۔ اسکو
اگر کوئی صحیح حل نہیں بنایا گیا تو غلط حل کو قبول کر لے گا۔ وہ ہر اس آدمی کی بات مان لے گا جو زمین دیدینے کا
وعدہ کرے، کیونکہ زمین اس کی جان ہے۔ اس کی مدد کرنے کو مغربی طاقتیں کھڑی نہیں ہوتیں نو مشرقی کسان کی مدد
کرنے کے چیلنج کو قبول نہیں کرتی تو کمیونزم کی فتح یقینی ہے، کل جو روس میں ہوا، آج جو چین میں ہو رہا ہے، وہی کل
وسطی مشرق اور دوسرے ملکوں میں ہوگا۔

مغربی طاقتوں کا مشرقی ملکوں کو قرضے دینا ایسا ہی ہے جیسے سرطان والے رخسار پر غارہ ملا جائے،
بیمار گالوں پر تندرستی کا غارہ نہیں چڑھ سکتا۔

دھشتی، بیروت، بغداد، مکہ، طہران، قاہرہ اور ان کے ساتھ لندن و واشنگٹن بھی ایک پیغمبر کے انتظار
میں ہیں جو سماجی مقصد و اصلاح کا جھنڈا لئے ہوئے عیسے کی طرح کاشتکار کو صوفیہ کہہ کر ہوش میں لائے کہ:-
”جاگ! جاگ!! اور طاقت کا مظاہرہ کر!“

جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب

از نیاز فتح پوری

آپ نے مارس ہنڈس کی زبان سے ایران اور مشرق وسطیٰ کے بعض اسلامی ممالک کی موجودہ اقتصادی حالت کو درست نہ کیا اور پیشہ دروں کو صنعت و حرفت کے صحیح راستہ پر ڈال کر ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو ایک نہ ایک دن کسانوں اور مزدوروں کے جذبات کا ناقابل ضبط ہو جانا ضروری ہے۔ ہنڈس اسے ”مستقبل کی تلاش“ کہتا ہے، لیکن میرے نزدیک اسے ”مستقبل کا سایہ“ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، جو مادی حقیقت میں تبدیل ہونے کے لئے نہایت تیزی سے آگے بڑھتا آرہا ہے۔

اسلامی ممالک میں جو ذہنی انقلاب اس وقت پایا جاتا ہے، وہ آج کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پہلی جنگ عظیم کے وقت ہی پڑ گئی تھی لیکن ہنڈس سے اس پر آج تک کوئی عمارت قائم نہیں کی گئی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کچھ زمانہ اور اسی طرح گزر جائے، لیکن یہ یقین کرنا کہ ہمیشہ یہی حالت رہے گی درست نہیں۔ کوہ آتش فشاں بعض اوقات بغیر دھواں دئے ہوئے بھی پھوٹ پڑتا ہے اور یہاں تو دھواں بھی عرصہ سے اٹھ رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت ابل پڑے۔ اس کتاب کے قارئین، چودھویں اور پندرھویں باب خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، کیونکہ وہ نہ صرف عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے بڑا زبردست درس عمل اپنے اندر رکھتے ہیں، آج فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے اختلاف نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس سے ہر شخص باخبر ہے اور عربوں کے ان جذبات سے ہر مسلمان کو ہمدردی ہے کہ ارض فلسطین سے انھیں محروم نہ کیا جائے لیکن سوال یہ ہو کہ کیا عربوں کی یہ خواہش اور مسلمانوں کی یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کے ذمہ دار برطانیہ و امریکہ ہیں، تو یہ بھی غلط نہیں کہ برطانیہ و امریکہ کا یہ طرز عمل کسی مذہبی یا انسانی ہمدردی کی بنا پر نہ تھا بلکہ نتیجہ تھا یہودیوں کے علمی و اقتصادی اقتدار کا جو جنگ کے دوران ہی میں قائم ہو چکا تھا اور جس نے بعد از جنگ ایسی جذباتی رد کی شکل اختیار کر لی کہ اس کا مقابلہ امریکہ و برطانیہ کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

عربوں کو بہت پہلے سے معلوم تھا کہ یہودی ارض فلسطین کو اپنا قدیم وطن سمجھ کر وہاں آباد ہونا چاہتے ہیں، لیکن

انہوں نے اس سیلاب کے روکنے کی جوتدبیر اختیار کیں، وہ یکسر سفیہانہ اور غیر فطری تھیں، سفیہانہ اس لئے کہ انہوں نے امریکہ و برطانیہ پر اعتماد کیا اور غیر فطری اس لئے کہ وہ خود اپنے آپ کو اس سیلاب کے روکنے کا اپنا ہناک یہودی ارض فلسطین میں اس شان کے ساتھ داخل ہوئے کہ ان کے پاس علم تھا، دولت تھی، غیر معمولی فراست و دانائی تھی، فوج تھی، اسلحہ تھے اور اسی کے ساتھ عزم راسخ۔ اس کا مقابلہ میں عربوں کے پاس کیا تھا؟، جہل، افلاس، فقر و فاقہ، تشقت و انتشار، خود غرضی، کم ہمتی اور لامرکزیت! پھر ان دونوں کے تصادم کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا اور اسے کوئی قوت نہ روک سکتی تھی۔ اس لئے عربوں کو اب اس ٹکڑے میں اپنا وقت نہ ضائع کرنا چاہئے کہ وہ یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیں، بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہودی فلسطین سے آگے بڑھ کر سارے عربستان پر چھا جائیں، کیونکہ جس تیزی کے ساتھ وہ ترقی کر رہے ہیں، اور جن اصول پر وہ اپنی حکومت کی بنیاد قائم کر رہے ہیں، وہ تمام عربستان کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ عرب ممالک کے لئے یہ بڑا سخت خطرہ ہے۔

پھر اس خطرہ کے دور کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، بالکل وہی جس سے یہ خطرہ پیدا ہوا ہے یعنی اصلاح و ترقی کے وہی اصول جو یہود نے اختیار کئے ہیں اور اقتصادی بد حالی دور کرنے کے وہی طریقے جنہوں نے فلسطین کے ریگزاروں کو چند دن کے اندر ”جنت عدن“ میں تبدیل کر دیا۔ پھر حیرت کی بات یہ نہیں ہے کہ جن اصول کو مشنظر رکھ کر آج یہود فلسطین پر چھائے جا رہے ہیں، وہ اسلام ہی کے متبعین کئے ہوئے اصول ہیں، بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جس ”ہادی اکبر“ نے یہ اصول بتائے تھے اسی کے متبعین آج اس سے منحرف نظر آتے ہیں اور اسس خدائی فیصلہ کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ

”ان الارض پر شہا عبادی الصلوٰۃ“

ہندس نے اپنی کتاب میں مسلم حکومتوں کے صرف اقتصادیات سے بحث کی ہے اور سیاسی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے، غالباً اس لئے کہ یہ اس کے مطالعہ سیاحت کا مقصود نہ تھا، لیکن جب تک تصویر کا دوسرا رخ (سیاست) سامنے نہ آئے، ان حقیقی اسباب کا پتہ نہیں چل سکتا جنہوں نے اسلامی ممالک میں یہ بچل پیدا کی اور نہ یورپ کے سرمایہ دارانہ ملکوں کی ان ریشہ دوانیوں کا علم ہو سکتا ہے، جن کا مقصود ہی اسلامی ممالک کو ہمیشہ زبوں حال بنائے رکھنا ہے تاکہ وہ اٹکی گرفت سے باہر نہ ہونے پائیں۔ اس لئے ہم سالنامہ کے دوسرے حصہ میں تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ پہلی جنگ کے وقت اور اس کے بعد اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کے اسباب کیا تھے اور بعد کو انہوں نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں، اس مقالہ کی ترتیب میں ہم نے میڈن جیکسن کی کتاب پوسٹ وار ورلڈ سے مدد لی ہے، کیونکہ اس موضوع پر لکھنے والے مغربی مورخین میں جیکسن ہی تنہا وہ شخص ہے جس نے کافی دیانت سے کام لیا اور عصبیت سے محفوظ رہا۔

جمہوریت ترکی

اسلام اور عیسویت کی تاریخ میں ایک مماثلت بہت عجیب پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح چودھویں صدی عیسوی میں مسیحوں نے پوپ اور مقدس سلطنت روم کا جو اگروں سے اتار کر اپنی اپنی قومی سلطنتیں علیحدہ بنالیں، اسی طرح چودھویں صدی ہجری میں، خلافت کی زنجیر ٹوٹنے کے بعد مسلمانوں کی بھی متعدد حکومتیں قائم ہو گئیں۔

اس سے قبل ترکوں کی حکومت بہت وسیع تھی جس میں عربستان کی مسلم آبادی کے علاوہ یورپ کے بعض حصوں کی عیسوی آبادی بھی شامل تھی، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں وہ انحطاط کی آخری منزل سے گزر رہی تھی۔ اور اس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ نہ ہم اسے صحیح معنی میں مسلم حکومت کہہ سکتے تھے، نہ ترکی حکومت بلکہ سچ پوچھئے تو اسے خود مختار سلطنت بھی نہ کہہ سکتے تھے۔

مسلم حکومت تو وہ اس لئے نہ تھی کہ مسلمانوں کی کثیر آبادی اس کے قلمرو سے باہر رہتی تھی، ترکی حکومت اس کو اس لئے نہ کہہ سکتے تھے کہ اس کی زبان عربی تھی، قوانین عربی تھے اور مذہبی علماء ہر جگہ ذخیل تھے، خود مختار حکومت نہ کہہ سکنے کا سبب یہ تھا کہ اپنے ملک کی غیر مسلم قوموں پر اسے کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، ان کی عدالتیں الگ تھیں، ان کے قوانین علیحدہ تھے اور حکومت کی طرف سے ان کو اجازت تھی کہ وہ اپنے تمام معاملات بالا بالا اپنے اپنے سفارت خانوں ہی کے ذریعہ سے طے کریں۔

سلطان عبدالحمید خاں ثانی (۱۸۷۹ء - ۱۹۰۹ء) نے ایک بار اس کی کوشش بھی کی کہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے روحانی و دینی پیشوا تسلیم کر لئے جائیں اور اسی کوشش کے سلسلہ میں انھوں نے مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے قسطنطنیہ سے مدینہ تک ریل کا سلسلہ بھی قائم کر دیا، لیکن ان کے اس اقدام کو صرف سیاسی چال جان کر ایک طرف مہدی سوڈانی نے بغاوت کر دی، دوسری طرف عرب میں وہابی تحریک شروع ہو گئی۔ اور ترکی حکومت مرکزی مسلم حکومت نہ بن سکی۔

جب ترکی کو روحانی پیشوائی حاصل کرنے کی امید ختم ہو گئی تو پھر اس نے یہ کوشش کی کہ اگر وہ مذہبی

حیثیت سے تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکز امید نہیں بن سکتی تو شاہنشاہیت ہی کے حیثیت سے اس کو استوار کیا جائے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی ایک جماعت نے جو پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے سوچا کہ کیوں نہ فرانسیسی حکومت کے اصول کو سامنے رکھ کر ایک ڈاکٹر ٹپک قسم کی حکومت قائم کی جائے جس میں مسلم، عیسائی، یہودی، ترک، عرب وغیرہ سب کو نمایندگی حاصل ہو، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں ”انجمن اتحاد و ترقی“ کے نام سے سالونیکا میں سلطان ترکی کے خلاف نعرہ انقلاب بلند کیا گیا اور جدید کانسٹیٹیوشن کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ خیال تھا کہ سلطان سختی سے اس تحریک کو دبا دے گا، لیکن حالات دیکھ کر اس نے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور ”انجمن اتحاد و ترقی“ برسرِ اقتدار آگئی۔ اس میں شک نہیں کہ جماعتی تحریک کی یہ کامیابی بڑی کامیابی تھی، لیکن ”انجمن اتحاد و ترقی“ کے اس اقتدار کو بلقانی ریاستوں نے پسند نہ کیا اور ترکی کے خلاف جنگ شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلغاریہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، یونان نے کریٹ پر قبضہ کر لیا، آسٹریا نے بوسینا اور ہرزگووینا لے لیا اور اٹلی، طرابلس کو دبا بیٹھا۔

ان کے دیکھا دیکھی عربوں نے بھی ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ بغداد میں عراقی افسروں نے ایک خفیہ سوسائٹی آزادی عراق کے لئے بنائی، دمشق میں بھی اسی طرح کی سوسائٹیاں شام کی خود مختاری کے لئے بننے لگیں، مکہ میں شریف حسین اپنی حکومت کا خواب دیکھنے لگا اور نجد میں ابن سعود نے وہابی حکومت کی طرح ڈال دی۔ اس میں شک نہیں کہ عربستان کی یہ تحریک آزادی برسوں تک کامیاب نہ ہوتی اور ترکی کی نئی حکومت اس کو بہ آسانی دبا دیتی، لیکن بد قسمتی سے اسی دوران میں جنگ شروع ہو گئی (۱۹۱۴ء) اور ترکی نے اپنی قسمت جبرمتی کے ساتھ وابستہ کر دی۔

ترکی کی حکومت نے اس جنگ کو بڑی ہی خدا ساز بات سمجھا۔ اس نے سوچا کہ جبرمتی کے روپیہ سے وہ اپنی فوج کو مضبوط و آراستہ کر کے اپنے قدیم دشمن روس سے بھی انتقام لے سکے گی اور عرب حکومتوں کے سر سے بھی آزاد کا سودا نکال دے گی لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا، اور عربوں نے سوچا کہ حصول آزادی کا یہی بہترین موقع ہے، چنانچہ جس وقت برطانیہ کی طرف سے ہندوستانی فوج نے عراق پر حملہ کیا تو یہاں کی فوج نے کوئی مقابلہ نہیں کیا، اسی طرح دمشق میں بھی اہل شام نے کوئی مدد ترکی کی نہیں کی، نجد میں ابن سعود انگریزوں سے رشوت لیکر بالکل غیر جانبدار بنارہا اور مکہ میں شریف حسین نے برطانیہ کے ہائی کمشنر متعینہ مصر سے گفتگو کر کے یہ طے کر لیا کہ اگر اس نے قبائل عرب کو ترکی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا تو عرب کا فرمانروا اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

اول اول برطانیہ نے حسین کے وعدہ ادا کو چنداں اہمیت نہ دی تھی کیونکہ درہ دانیال کی طرف سے

اس نے خود قسطنطنیہ پر حملہ کرنا طے کر لیا تھا، لیکن انگریز اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور ترکی فوج نے بڑی پامردی سے مقابلہ کر کے درہ دانیال سے انگریزوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی اثناء میں شریف حسین نے بغاوت کر دی اور ترکوں نے اس کے خلاف مدینہ میں قلعہ بندی کر کے مکہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس واقعہ سے عربوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا اور حسین کے پیروں کے بیٹے فیصل اور ٹی۔ اسی۔ لارنس کی قیادت میں تمام عرب قبائل نے مل کر حجاز کی طرف سے ترکوں کے خلاف خلیج سنائی پر دھاوا بول دیا۔

اسی کے ساتھ انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مصر کی طرف سے براہِ شام، ترکی پر حملہ کریں۔ مقابلہ کے لئے مصطفیٰ کمال کو بھیجا گیا، لیکن چونکہ ترکی فوجوں پر دو طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا اور عراق کی طرف سے بھی برطانوی فوجیں بڑھتی آرہی تھیں، اس لئے ترکی کو مجبوراً نومبر ۱۹۱۷ء میں صلح کرنا پڑی اور معاہدہ مدروس (MUDROS) کی رو سے، مصر اور عربستان کے علاقوں سے اسے دست بردار ہونا پڑا۔

ترکی کو مذہبی حکومت بنانے میں پہلے ہی ناکامی ہو چکی تھی، سلطان عبدالحمید نے ترکی کو مرکزی مسلم حکومت بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہا، انجمن اتحاد و ترقی نے اس کو شاہنشاہیت بنا نا چاہا اور کامیابی نہ ہوئی، اس لئے اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی کہ ترکی کو محض ترکی حکومت بنایا جائے، لیکن اس کی تکمیل کیونکر ہو اور کون اس اہم خدمت کو انجام دے، اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

سلطان وحید الدین اپنی جگہ ڈر رہے تھے کہ اگر اب ترکی میں کوئی قومی تحریک شروع ہوئی تو اتحادیوں اس بہانہ سے اناطولیا کو بھی ہتھیلیں گے، اسی طرح انجمن اتحاد و ترقی بھی اپنی جگہ خائف تھی اور اس کے ارکان طلب کی شکست کے بعد ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے۔ اب صرف ایک ہی شخص رہ گیا تھا جسے سب رو سا تھا کہ قومی روح بھونک کر اب بھی ترکی کو بچایا جاسکتا ہے اور وہ مصطفیٰ کمال تھا، لیکن اس وقت وہ بھی قسطنطنیہ کے مضافات میں چھپا ہوا تھا، کیونکہ انگریز اس فکر میں تھے کہ اسے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیں۔

مصطفیٰ کمال بھی دوسرے لیڈروں کی طرح خود اس جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا جس کو اسے آزاد کرنا تھا، اس کا باپ البانی تھا اور ماں مقدونیہ کی۔ وہ ۱۸۷۷ء میں بمقام سالونیکا پیدا ہوا اور مدرسہ حریہ میں تعلیم پائی، ۱۸۹۷ء میں اس کو فوج میں کمیشن ملا اور اس کے بعد سے اس کی زندگی لڑائی میں بسر ہوئی۔ درویشوں کو اس نے شکست دی، بلغاریہ سے اس نے جنگ کی، طرابلس میں اطالوی فوجوں کا اسے مقابلہ کیا، قفقاز میں روسی افواج کے سامنے وہ سینہ سپر رہا اور گیلی پول میں اس نے برطانوی فوج کو

ناکوں چنے چبوا دئے۔ الغرض ایک محارب کی حیثیت سے اس کی قابلیت و اہلیت مسلم تھی اور ترک کی سپاہ اس پر جان دیتی تھی، لیکن سیاسی حلقوں میں وہ اپنی صاف گوئی اور سخت کلامی کی وجہ سے مقبول نہ تھا اور انجمن اتحاد ترقی کے ارکان سے اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ خلیفہ اس سے مرعوب تھا لیکن دربار خلافت میں اس کے مخالف اتنے تھے کہ وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ نکل سکتی تھی، اس لئے خلیفہ نے اسے ٹالنے کے لئے قسطنطنیہ سے باہر مشرقی اناطولیا کی طرف اس کمیشن کا افسر بنا کر بھیج دیا جو مشرقی اناطولیا کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے یہاں کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے بجائے اسے اور مسلح کرنا شروع کر دیا اور جب اس کی اطلاع سلطان وحید الدین کو ملی اور انھوں نے مصطفیٰ کمال کو واپس بلانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں آزادی اور خود مختاری حاصل کئے بغیر واپس نہ آؤں گا۔

مصطفیٰ کمال کا یہ خیال بظاہر ناممکن العمل تھا، کیونکہ سلطان اور ترک حکومت اس کے خلاف تھی اتحادین بھی اس کے دشمن تھے، چنانچہ سلطان نے کردوں کو اس کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کی مدد سے یونان نے سمرنا میں اپنی فوجیں اتار دیں، لیکن مصطفیٰ کمال نے انھیں واقعات سے فائدہ اٹھایا اور ترک آبادی کو یہ یقین دلا کر کہ سلطان اور اتحادین دونوں ترک قوم کو غلام بنانا چاہتے ہیں، عوام کی ہمدردی حاصل کر لیں اور وہ جوق در جوق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔

مصطفیٰ کمال نے ہوا کا یہ رخ دیکھ کر نیشنل اسمبلی کے قیام کا اعلان کر دیا اور جون ۱۹۱۹ء میں بمقام ارض روم اس کا پہلا جلسہ طلب کیا۔ اس جلسہ میں مصطفیٰ کمال کو پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ ستمبر میں بمقام سیواس اس نے پھر اسمبلی کا جلسہ طلب کیا اور ایک مجلس عالمہ مرتب کر کے انگورآ کو صدر مقام بنالیا۔

مصطفیٰ کمال نے یہ سوچ کر کہ عرب ریاستوں پر قبضہ ہو نہیں سکتا اور قسطنطنیہ کی حکومت اس کی مدد کے لئے طیار نہیں، یہ فیصلہ کیا کہ ترک قوم کا بقا صرف اس طرح ممکن ہے کہ اس علاقہ میں جہاں ترک مسلمانوں کی اکثریت ہے خالص ترک حکومت قائم کی جائے اور اس کا اعلان کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ترکی کی نئی حکومت کے قیام کا یہ اعلان ایسا تھا جس کو نہ خلیفہ پسند کرتا تھا نہ اتحادین اور بالکل ممکن ہے کہ قوم پرست ترکوں کی جو جماعت اس کے ساتھ ہو گئی تھی، وہ بھی تازہ جوش ٹھنڈا ہونے کے بعد اس کا ساتھ چھوڑ دیتی، لیکن اتحادیوں نے ۱۹۲۰ء میں تین ایسی غلطیاں کیں کہ ترک قوم کے جذبات حد درجہ مشتعل ہو گئے اور مصطفیٰ کمال کی قائم کی ہوئی حکومت زیادہ مستحکم ہو گئی۔

پہلی غلطی یہ تھی کہ انگورآ کے نیشنل پیکیٹ کے اعلان کے بعد اتحادین نے کہلا بھیجا کہ ترکوں کی نئی حکومت کو وہ تسلیم کرنے کے لئے طیار ہیں اگر قسطنطنیہ میں نیشنل اسمبلی کا جلسہ کر کے اس کا اعلان کیا جائے، انگورآ کے

ڈیلی گیٹ اس خبر کو سنکر خوش ہو گئے اور اس نوید پر قسطنطنیہ جا کر انھوں نے پارلیمنٹ کے پورے اجلاس میں نیشنل پیکیٹ کو منظور کرایا، لیکن اس کے دو مہینے بعد ہی اتحادی سپاہ نے قسطنطنیہ کی بہت سی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر کے چالیس نیشنلسٹ لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور مالٹا بھیج دیا۔ اس بدعہدی سے اتحادیوں کے خلاف ترکوں میں عام بدظنی پیدا ہو گئی۔

دوسری غلطی معاہدہ سیورس تھا۔ جسکی رد سے تھریس کا علاقہ اور سمترنا یونانیوں کو دیدیا گیا، عدلیہ، اٹلی کو اور صرف کوہستانی علاقہ ترکوں کو ملا، اس تقسیم نے ترکوں کو بالکل یقین دلادیا کہ اتحادیوں انھیں تباہ کر دینے پر تے ہوئے ہیں اور ان کی قومی اسپرٹ پوری قوت کے ساتھ ابھر آئی۔

تیسری غلطی یہ تھی کہ اتحادیوں (فرانس، برطانیہ، اٹلی) نے یونان کو ترکی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ترکی پر دباؤ ڈال کر معاہدہ کی شرائط تسلیم کرائی جائیں۔ یہ لڑائی تین سال ۱۹۲۲ء تک جاری رہی اور اتحادیوں نے یونان کی پوری مدد کی، لیکن آخر کار ترکوں کو فتح ہوئی اور معاہدہ سیورس کا عدم ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال کی یہ فتح معجزہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے صرف تیرہ ہزار ترک سپاہیوں سے جو پوری طرح مسلح بھی نہ تھے اور فنون جنگ سے بھی واقف نہ تھے، یونانیوں کی ۸۰ ہزار باقاعدہ آراستہ فوج کو باہر نکال دیا اور اپنا سارا علاقہ واپس لے لیا۔

ترکوں کی اس کامیابی کے بعد معاہدہ لاسین (۱۹۲۳ء) وجود میں آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کو پورا اناطولیا، مشرقی تھریس اور قسطنطنیہ مل گیا اسی کے ساتھ غیر ملکیوں کو جو غیر معمولی حقوق حاصل تھے وہ بھی ختم کر دئے گئے، ۱۰ لاکھ یہودی آبادی مشرقی اناطولیا سے یونان منتقل کی گئی اور اس طرح تاریخ میں بالکل پہلی مرتبہ ترکی کی قومی حکومت قائم ہوئی۔

لیکن اب مصطفیٰ کمال کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ اس حکومت کی بنیاد کو کیونکر استوار کیا جائے خود ترکوں کی کثیر آبادی سیاست سے بالکل ناواقف تھی اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ کس قسم کی حکومت قائم کی جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ سویٹ یونین میں شامل ہو جانا چاہئے۔ بعض خالص اسلامی حکومت کے قیام کی طرف مایل تھے اور بعض اسے مغربی انداز کی جمہوریت بنانا چاہتے تھے، لیکن مصطفیٰ کمال نے ان سب کی مخالفت کی کیونکہ سویٹ یونین میں شامل ہونا اس کے نزدیک اپنی آزادی کو ہاتھ سے کھودینا سمجھا، اسلامی حکومت میں پھر قدامت پسند طبقہ کے درخور کا اندیشہ تھا اور جمہوریت کا وہ اس لئے خلاف تھا کہ ترکی آبادی ابھی اس قابل نہ تھی کہ انتخاب اور رائے دہندگی کی اہمیت کو سمجھ سکے، اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ فی الحال ڈکٹیٹر شپ ہی موزوں ہے۔

چنانچہ جب معاہدہ لاسین کے بعد نیشنل اسمبلی کا اجلاس ہوا تو مصطفیٰ کمال اور عصمت بے نے ایک بل پیش کیا کہ ترکی کو جمہوری حکومت قرار دیا جائے اور کسی نہ کسی طرح اسے منظور کر کے مصطفیٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہو گیا، اب مصطفیٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہو گیا، اور اس کے اختیارات غیر معمولی وسیع ہو گئے۔ صدر کی حیثیت سے کاہنہ پر اسے اقتدار حاصل ہو گیا، پارٹی کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے سیاسی پالیسی پر پورا اختیار مل گیا اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے تمام فوجی نظام اس کے ہاتھ آ گیا۔

مصطفیٰ کمال کو صرف ایک ہی دھن تھی وہ یہ کہ ترکی قوم میں کسی طرح قوم پرستی کا صحیح جذبہ پیدا کیا جائے اور غیر ترکی عناصر کو نکال باہر کیا جائے اور صدر جمہوریہ ہونے کے بعد اس نے یہ کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں کئی باتیں اس کے سامنے تھیں، سب سے پہلے تو یہ کہ خلافت کے قصہ کو ختم کیا جائے، دوسرے یہ کہ ترکوں میں جو عربوں کی سی مذہبی ذہنیت پیدا ہو گئی ہے اسے دور کیا جائے اور تیسرے یہ کہ قدیم قوانین کو منسوخ کر کے جدید قوانین نافذ کئے جائیں۔ چنانچہ اپنے انتخاب کے چند مہینے بعد ہی اس نے سب سے پہلے منصب خلافت کے منسوخ کرنے کی تدابیر شروع کر دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کام آسان نہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں جو روایتی احترام منصب خلافت کا صدیوں سے جاگزیں چلا آ رہا ہے اس کو دور کرنا مشکل ہے، تاہم وہ ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہتا تھا۔ اتفاق سے اس دوران میں سر آغا خاں نے منصب خلافت کے احترام کے بقا کے متعلق ترکی جمہوریت سے پر زور اپیل کی اور یہ اپیل مصطفیٰ کمال کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس نے ترکی قوم کے سامنے اس مسئلہ کو اس صورت سے پیش کیا کہ سر آغا خاں نے یہ اپیل برطانیہ کے اشارہ سے کی ہے اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ترکی جمہوریت کو فنا کر دیا جائے۔

ترکوں پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور نیشنل اسمبلی نے باتفاق رائے منصب خلافت کی تینخ کا فیصلہ کر دیا۔ اس وقت عبدالحمید خلیفہ تھے۔ ان کو معزول کر کے مع ان کے متعلقین کے یورپ بھیج دیا گیا۔ نیشنل اسمبلی نے اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر دیا کہ موجودہ قوانین بھی منسوخ کر کے جدید قوانین مغربی اصول پر طیار کر لئے جائیں اور اس پر بھی فوراً عملدرآمد شروع ہو گیا۔ لیکن چونکہ مذہبی خیالات یوں دفعتاً ختم نہیں ہو سکتے، اس لئے نیشنل اسمبلی کے حزب مخالف نے مصطفیٰ کمال کی مخالفت شروع کی اور کردستان میں بغاوت کرادی۔ جب تین مہینے کے بعد مشکل سے یہ بغاوت فرو ہوئی تو مصطفیٰ کمال نے سوچا کہ کام یوں نرمی سے نہیں چلے گا، اس لئے اس نے پہلے تو اسمبلی سے حزب مخالف کے افراد کو نکالا اور پھر پوری سختی کے ساتھ اس نے ملاؤں اور مذہبی اداروں کو ختم کیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اقتصادی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ جب تک ترکوں کی ذہنیت کو نہ بدلا جائے اس میں کامیابی ممکن نہیں، اس لئے اس نے سب سے پہلے تعلیمی نصاب کو بدلا اور تمام

مذہبی مکاتب و مدارس بند کر کے جدید مدارس مغربی اصول پر قائم کئے۔

وہ سمجھتا تھا کہ ذہنیت بدلنے کے لئے ظاہری وضع قطع کا بدلنا بھی ضروری ہے، اس لئے اس نے ترکی ٹوپی کی جگہ چمچے دار ٹوپی کو حکماً رائج کیا، برقع استعمال کرنا ممنوع قرار دیا اور رسم خط لاطینی کر دیا۔ ٹوپی اور رسم خط کا مسئلہ تو خیر اتنا سخت نہ تھا، لیکن پردہ کی ممانعت نے قصبات و دیہات میں کافی بے چینی پیدا کر دی کیونکہ وہاں کی عورتیں قدیم اسلامی روایات کی سختی سے پابند تھیں اور وہ بے پردگی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں، تاہم رفتہ رفتہ تمام مزاحمت دور ہوتی گئی اور ۶ سال کے عرصہ میں ترکی جمہوریت مغربی اصول پر قائم ہو گئی۔

اب مصطفیٰ کمال کے سامنے دوسرا اہم سوال اقتصادی اصلاحات کا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ ترکی اپنی آب و ہوا، زرخیز وادیوں اور صحرائی و معدنی پیداوار کے لحاظ سے ہر قسم کی زرعی و صنعتی ترقی کر سکتا ہے، لیکن ان قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں ایک سب سے بڑا مانع حائل تھا یعنی یہ کہ حکومت بالکل مفلس تھی اور وہ نہ دوسرے ملکوں سے قرض لینا چاہتا تھا نہ یہ پسند کرتا تھا کہ وہاں کے سرمایہ دار یہاں آکر صنعت کو ترقی دیں۔ اس لئے اسے سب سے پہلے زراعت کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور پہلے خود ایک فارم طیار کیا جس میں جدید آلات کٹا وری سے کام ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے آٹھ زراعتی کالج قائم کئے اور زراعتی بینک قائم کر کے کسانوں کو قرض اور زراعتی مشینری کی فراہمی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کسانوں میں جدید آلات کے ذریعہ سے زراعت کرنے کا رواج عام ہونے لگا اور رفتہ رفتہ وہاں کے تمام کسانوں نے اسے قبول کر لیا۔

اسی کے ساتھ دوسرا سوال صنعت و تجارت کی ترقی کا تھا۔ تجارتی نقطہ نظر سے ترکی کی جغرافیائی پوزیشن نہایت اچھی ہے کیونکہ ایشیا اور یورپ کے درمیان وہ ایک چوراہے کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح پیداوار کے لحاظ سے بھی ترقی کے اسباب اس کے پاس موجود ہیں۔ سمندر کا انجیر، ترکی کا تاناکو، روئی اور زیتون وہاں کی خاص اشیاء ہیں جن کی مانگ دنیا میں بہت ہے۔ ہر چند جنگ کے بعد بین الاقوامی تجارت کے لئے اسباب مساعد نہ تھے لیکن مصطفیٰ کمال نے روس، اٹلی، یوگوسلیویا، رومانیہ اور یونان سے تجارتی معاہدات کر کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر لی تھی اور حمل و نقل کے لئے ہر سال ۵۰ میل ریلوے لائن بھی طیار کی جانے لگی۔ قیام جمہوریت سے قبل ترکی ہر قسم کی صنعت سے محروم تھا، اور گو قیام جمہوریت کے بعد متعدد فیکٹریاں قائم ہوئیں جن میں سگریٹ بنانے والیں بننے اور فوج کی وردی کے لئے پارچہ باغی کی فیکٹریاں خاص اہمیت رکھتی ہیں، تاہم کوئی قابل ذکر ترقی اس میں نہ ہو سکی، ان حالات کو دیکھ کر وہاں کے کارخانہ داروں نے احتجاج کیا کہ حکومت آمدنی کا زیادہ حصہ فوج پر صرف کر رہی ہے اور صنعتی اداروں کی بہت افزائی بہت کم ہوتی ہے، اس لئے یا تو روپیہ باہر سے قرض لیا جائے یا فوجی بجٹ کو کم کیا جائے۔

مصطفیٰ کمال نے اس احتجاج سے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکی قوم میں غالباً اب اتنی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ملک کے مالیات اور اقتصادی مسائل کو سمجھ سکے، اس لئے اس نے عصمت پاشا کی قیادت میں حزب مخالف کے لئے بھی اسمبلی میں جگہ نکالی تاکہ ترکی قوم ایک ذمہ دار جمہوری حکومت کے صحیح اصول سے واقف ہو سکے۔ اس سے قبل وہاں ایک ہی پارٹی کی حکومت تھی اور حکومت کی تقریروں اور تجویزوں پر اظہار رائے بالکل ممنوع تھا اور کوئی اسکی مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب حزب مخالف قائم کر کے آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی عام اجازت دیدی گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں فتحی پاشا کی سرکردگی میں ایک لبرل جمہوریت پسند پارٹی قائم کی گئی جو حکومت کی تجویزوں پر کھلی ہوئی تنقید کرے۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔

ترکوں کی قدیم ذہنیت اس بات کو سمجھ ہی نہ سکتی تھی کہ حکمران جماعت کی مخالفت بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے، اس لئے انھوں نے مصطفیٰ کمال کے اس طرز عمل سے یہ سمجھا کہ اب وہ ضعیف ہو گیا ہے اور حکومت سنبھالنے کی طاقت اس میں نہیں رہی۔ اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ مختلف سمتوں سے قدامت پرست اور باغیانہ عناصر رکھنے والی جماعتوں نے شورش شروع کر دی، سمرنا میں ایک شخص نے ہمدی موعود ہونے کا دعویٰ کر کے لوگوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنا شروع کیا، گردوں نے پھر حکومت کے خلاف ہتھیار سنبھال لئے اور ملّا پھر سر اٹھانے لگے مصطفیٰ کمال نے مجبور ہو کر حزب مخالف کو توڑ دیا اور ان تمام شورشوں کو دبانے میں پوری سختی سے کام لیا۔

اس نے کہا کہ ”ترک قوم ابھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ مغربی اصول پر طریق حکمرانی کو سمجھ سکے اس لئے ضرورت ہو کہ میں کم از کم پندرہ سال تک اور آمرانہ حیثیت سے کام کر دوں اور ترک پہلک کو سیاسیات میں حصہ نہ لینے دوں۔“

الغرض ترک جمہوریت کا قیام اس میں شک نہیں کہ محض مصطفیٰ کمال کے غیر معمولی عزم و ثبات کا نتیجہ تھا اور وہ اپنی زندگی ہی میں سیاسی دنیا میں اس کے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر گیا۔ مصطفیٰ کمال کے انتقال کے بعد بھی حکومت کی پالیسی قریب قریب وہی رہی جو اس نے قائم کی تھی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو دوسری جنگ عظیم میں اس کی پالیسی کیا ہوتی۔ تاہم اس جنگ میں ترکی کا غیر جانبدار رہنا اس کے لئے مفید ہی ہوا اور وہ ان تباہیوں سے بچ گیا جو دوسری حکومتوں پر شرکت جنگ کی وجہ سے نازل ہوئیں۔ فی الحال اس نے اپنی قسمت اینگلو امریکن بلاک سے وابستہ کر دی ہے اور اٹلانٹک پیکیٹ میں شامل کئے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ امریکہ نے مارشل پلان کے تحت ترکی کی کافی مدد بھی کی ہے، لیکن اس سے زیادہ ترقی تنظیم میں کام لیا گیا جو امریکہ کا اصل مقصود تھا اور ملک کے اقتصادی حالات کو درست کرنے میں اسے صرف نہیں کیا گیا۔

فوجی ترتیب و تنظیم اور تمدنی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ترکی کا مقابلہ کوئی اسلامی حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے باوجود چھوٹی سلطنت ہونے کے یورپ و امریکہ میں اس کی دھماک اور سا کہ کسی بڑی سلطنت سے کم نہیں۔

عرب اور اتحادی طاقتیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ جمہوریت ترکیب کبھی قائم نہ ہو سکتی اگر پہلی جنگ کے وقت اتحادی طاقتوں نے عربستان کے علاقہ سے اسے محروم نہ کر دیا ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ خود اتحادیوں نے عربستان کے متعلق کیا سوچا تھا یہ معینہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔

اہل عرب کو یقین تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ آزاد ہو جائیں گے جس کا وعدہ ان سے کیا گیا تھا اور اسی لالچ سے انھوں نے حجاز اور شام میں ترکوں کا مقابلہ کیا تھا، سرمنبری میکوہن (برطانوی ہائی کمشنر متعینہ مصر) نے جب کہ کے گورنر حسین کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تو حسین نے یہ شرط پیش کی کہ جنگ کے بعد پورا عربستان (عدن کے سوا) آزاد سمجھا جائے گا، میکوہن نے بصرہ، بغداد اور حلب، بیروت کے بعض علاقوں کے سوا (جن پر برطانیہ و فرانس کو زیر اقتدار رہنا تھا) باقی تمام عربستان کی آزادی کا وعدہ برطانیہ کی طرف سے کر لیا تھا، لیکن جنگ ہونے جاری ہی تھی کہ اہل عرب برطانوی وعدوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے، کیونکہ انھیں پتہ چل گیا تھا کہ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ۱۹۱۶ء میں عرب کے مستقبل کے متعلق کچھ اور ہو چکا ہے۔ اس معاہدہ کے جو شرائط انھیں روسی ذرائع سے معلوم ہوئے وہ یہ تھے کہ عراق اور فلسطین کے دو بندرگاہ برطانیہ کے زیر سیادت رہیں گے، اور سواحل شام کا علاقہ مع دمشق، حلب اور موصل کے فرانس کے زیر اثر رہے گا۔ اسی وقت برطانیہ نے یہودیوں سے بھی یہ وعدہ کر لیا تھا کہ فلسطین میں وہ اپنا قومی وطن بنا سکیں گے۔ برطانیہ کی اس عہد شکنی کا عربوں کو اور زیادہ یقین اس واقعہ سے بھی ہو گیا کہ اس نے صوبہ عراق میں فوجی حکومت قائم کر دی جو ہندوستانی افروں پر مشتمل تھی۔

تاہم جب لڑائی ختم ہوئی اور صلح کے اصول و شرائط متعین ہونے لگے تو پریسیڈنٹ ولسن کے بتائے ہوئے چودہ نکات کے پیش نظر عربوں کو پھر اپنی آزادی کی توقع قائم ہو گئی، کیونکہ پریسیڈنٹ ولسن نے حکومتوں کی قسمت کے فیصلے کو زیادہ تر رائے عامہ پر منحصر رکھا تھا۔ لیکن عربوں کی اس امید پر سب سے پہلی ضرب تو یہ پہونچائی گئی کہ صلح کانفرنس (پیرس) میں مصر کے نمائندہ کو شرکت سے باز رکھا گیا اسی طرح عربستان کے دوسرے نمائندے

بھی اس کانفرنس میں شریک نہیں کئے گئے، صرف حجاز کی نمایندگی قبول کی گئی اور وہ بھی حسین نہیں بلکہ اسکے بیٹے فیصل کو نمایندہ تجویز کیا گیا کیونکہ اس نے کہہ دیا تھا کہ میں دمشق سے زیادہ کسی اور چیز کی تمنا نہیں رکھتا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ارکان صلیح کانفرنس کے لئے مشرق وسطیٰ کا مسئلہ سرزمین عرب کی تقسیم اتنا زیادہ اہم نہ تھا جتنا جرمنی کے بٹوارہ کا اور سب اسی میں مصروف تھے علاوہ

اس کے بڑی بڑی طاقتوں کے بعض نمائندے عربستان کے حالات سے زیادہ واقف بھی نہ تھے، وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ جزیرہ نمائے عرب نام ہے ایک بہت بڑے صحرا اور صرف اس کے سواصل کا جو اقتصاد، زرعی اور سیاسی حیثیت سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، مگر صرف نہر سوئز کی وجہ سے نگاہ میں تھا اور فلسطین، شام و عراق کی اہمیت صرف اس لئے تھی کہ ہندوستان کا راستہ ادھر سے بھی جاتا ہے، موصل اور خلیج فارس کی اہمیت البتہ پٹرول کے چشموں کی وجہ سے کچھ زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ رہا عرب کا مرکزی حصہ سو اس سے وہ بالکل ناواقف تھے یہاں تک کہ ابن سعود اور اس کی وہابی تحریک کا بھی انھیں کوئی علم نہ تھا۔ ان کا تنہا مشیر صرف لارنس تھا اور وہ خود بھی ابن سعود اور اس کی تحریک سے زیادہ آگاہ نہ تھا۔

صلیح کانفرنس میں کبھی کبھی مشرق وسطیٰ کا بھی ذکر آ جاتا تھا اور دو مختلف رائیں اس سلسلہ میں ظاہر کی جاتی تھیں، ایک جماعت تو یہ کہتی تھی کہ عربوں سے جو وعدہ آزادی کا کیا گیا ہے وہ پورا کرنا چاہئے، دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ اگر برطانیہ نے عراق چھوڑ دیا تو ترکی پھر اس پر قابض ہو جائے گا اور نہر سوئز بھی ہاتھ سے نکل جائے گی علاوہ اس کے فرانس بھی اس پر آمادہ نہ تھا کہ شام سے اس کا اقتدار اٹھ جائے۔

آخر کار ۱۹۱۷ء میں یہ طے پایا کہ وہ مستعمرات یا ریاستیں جو جنگ کے بعد دوسری حکومتوں کے اثر سے آزاد ہو گئی ہیں (مثلاً عرب جو ترکی کی حکومت سے علاحدہ ہو گیا ہے) ترقی یافتہ حکومتوں کی نگرانی میں دیدی جائیں تاکہ وہاں کی آبادی کو آزاد و خود مختار حکومت قائم کرنے کا اہل بنایا جاسکے وہی پرانی چال جو دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے مغربی حکومتیں ہمیشہ چلتی رہی ہیں، عرب کے مسئلہ میں بھی چلی گئی۔ اس اصولی بات کے طے ہونے کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک بین الاقوامی کمیشن خود عربستان جا کر یہ معلوم کرے کہ وہاں کے لوگوں کی کیا رائے ہے لیکن چونکہ فرانس نے اپنا کوئی نمائندہ اس کمیشن میں مقرر نہیں کیا تھا اس لئے اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا اور اتحادیوں نے خود ہی ۱۹۱۷ء میں یہ فیصلہ کر دیا کہ:

۱۔ عراق، برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔

۲۔ شام اور کوہستان طارس و صحرائے سینا کا درمیانی علاقہ برطانیہ و فرانس کے درمیان اس طرح تقسیم کر دیا جائے گا کہ فلسطین اور شرق اردن کی تولیت میں رہیں گے اور جنوبی حصہ یعنی سواصل لبنان اور دمشق، فرانس

کی تولیت میں اسی کے ساتھ شریف حسین کو جس کی عمر ۶ سال کی تھی حجاز کا فرمانروا تسلیم کیا گیا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ حجاز اقتصادی حیثیت سے کوئی اہم چیز نہیں اور صرف حبلج ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ حسین کا ولی عہد اس کا بڑا بیٹا علی مقرر کیا گیا، دوسرے بیٹے عبداللہ کو زیر سیادت برطانیہ والی عراق تسلیم کیا گیا اور فیصل کو دمشق دیدیا گیا۔ الغرض اس طرح شریف کے خاندان والوں کا منہ بند کر دیا، لیکن سلطنت عثمانیہ سے جدا ہونے والے دوسرے علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ آرمینیا بدستور ترکوں کے پاس رہا، مصر، برطانیہ کے سیادت سے باہر نہ نکل سکا، اور ابن سعود سرزمین نجد میں چاروں طرف شریفی خاندان والوں سے گھر گیا۔

شام اور فرانس شام میں فرانس کی تولیت وہاں کے باشندوں کی مرضی کے بالکل خلاف تھی اور ہر چند شام کی ۳۰ لاکھ کی آبادی جس میں مسلم کا شتکار و زمیندار، دروزی قبائل، لبنانی تاجر شامل ہیں اپنے مختلف اغراض و مقاصد کے لحاظ سے باہدگر متفق نہ تھے، لیکن تولیت کے سب مخالف تھے اس لئے فرانس کو فوجی طاقت سے اپنی تولیت قائم کرنا پڑی اور اگست ۱۹۲۰ء میں فیصل کو دمشق سے نکال کر وہاں فوجی حکومت قائم کر دی اور شام کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے پانچ جدا گانہ ریاستیں قائم کر دیں جن کا نظم و نسق، بجٹ، جھنڈا سب علیحدہ تھا۔

اہل شام کو یہ تقسیم سخت ناگوار ہوئی اور عیسوی اقلیت کے ساتھ جو غیر معمولی مراعات روارکھی گئیں انھوں نے مسلمانوں کو بہت برہم کر دیا۔ دروزی قبائل نے اس کی عملی مخالفت شروع کر دی اور جب یہ مخالفت زیادہ سنگین ہو گئی تو ۱۹۲۵ء میں فرانسیسی حکومت نے دھوکا دیکر دروزی لیڈروں کو دمشق گھنٹو کے لئے بلایا اور انھیں قید کر لیا۔ اس واقعہ سے سخت برہمی پیدا ہو گئی اور دروزیوں نے پوری قوت کے ساتھ بغاوت شروع کر دی۔ فرانسیسیوں نے اس کے جواب میں مسلسل ۲۴ گھنٹے تک دمشق پر گولہ باری کر کے اسے کھنڈر کر دیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد فرانسیسی افواج کی تعداد یہاں ۵۰ ہزار بڑھا دی گئی اور دیہات بھی کثرت سے جلائے۔

اس واقعہ سے تمام دنیا میں سنسنی پھیل گئی اور فرانس کو مجبور کیا گیا کہ وہ کوئی سمجھوتا کرے۔ فرانس نے ایک آزمودہ کار شخص ہنری جوئال کو یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا اور اس نے بجائے تولیت قائم رکھنے کے لئے اہل شام سے مستقل معاہدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار اہل شام نے یہ محسوس کیا کہ وہ فرانسیسی حکومت کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

تولیت کی کمیشن یہ بات پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ آزاد انتخاب کے ذریعہ سے کانسی ٹونٹ اسمبلی کے ارکان

چنے جائیں اور برطانیہ نے عراق نے بھی اسی اصول پر عمل کیا تھا، اس لئے شام کے فرانسیسی گورنر نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور دو سال کے اندر یہاں اسمبلی قائم ہو سکی۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں جب گورنر نے اسمبلی کے سامنے شرائط معاہدہ پیش کیں تو کثرت رائے سے اسے اہل شام نے رد کر دیا۔ کیونکہ ان شرائط کی رو سے شام کی تقسیم پانچ ریاستوں میں بدستور قائم رکھی گئی تھی اور حکومت فرانس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ شام میں جتنی فوج چاہے رکھے اور جتنے ہوائی اڈے چاہے قائم کر سکتا ہے۔

برطانیہ اور یہود فرانس کو جو ناکامی شام میں ہوئی اس سے زیادہ برطانیہ کو فلسطین میں ہوئی ہر چند عرب دونوں سے نفرت کرتے تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ شام میں کم از کم انہیں یہ تو معلوم تھا کہ فرانس کا کیا ارادہ ہے، لیکن فلسطین کے معاملہ میں تو برطانیہ کے ارادوں کی خبر ہی نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ کیفیت طاری تھی۔

ایک طرف برطانیہ یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ وہ عربوں کا طرفدار ہے اور دوسری طرف ہر سال ہزاروں یہودیوں کو بھی فلسطین میں بساتا جا رہا تھا۔

جو یہودی یہاں آ رہے تھے وہ زیادہ تر صیہونی جماعت کے تھے اور عرب انہیں کی طرف سے بہت مشتبہ تھے۔

برطانیہ نے جنگ سے پہلے یہودیوں کے قومی وطن کے لئے اوگاندہ تجویز کیا تھا لیکن ڈاکٹر ویزمین نے جو صیہونی لیڈر تھا اس تجویز کو رد کر دیا۔ ڈاکٹر ویزمین نے دوران جنگ میں برطانیہ کی بڑی اہم خدمت انجام دی تھی، ایک بار جنگ میں برطانیہ کو بڑی مشکل پیش آئی تھی کہ برطانیہ میں الکل جو پھٹنے والے گولوں کی تیاری کے لئے ضروری تھا بالکل ختم ہو گیا تھا اور اس کا حصول کسی طرح ممکن نہ تھا اس وقت ڈاکٹر ویزمین نے لکڑی سے الکل تیاری کے برطانیہ کو اس خطرہ سے بچا لیا تھا اور جب اس سے اس خدمت کا معاوضہ پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں اسے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ ”میری قوم کے لئے کچھ کیا جائے“

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ویزمین کی خواہش کو برطانیہ رد نہ کر سکتا تھا اس لئے نومبر ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے اعلان کر دیا (جسے اعلان بالفور کہتے ہیں) کہ ”حکومت برطانیہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن قرار دینے کی طرفدار ہے

۱۔ صیہونیت کی تحریک ایک یہودی فیلسوف ڈاکٹر ہرٹزل نے ۱۸۹۷ء میں شروع کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی و مذہبی مرکز قرار دیا جائے اور تیس سال کے عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ یہودی صیہونی ذہنیت کے فلسطین آکر آباد ہو گئے تھے۔

اور اس مقصد کی تکمیل کی پوری کوشش کرے گی، لیکن اسی کے ساتھ فلسطین میں جو یہودی آبادی پائی جاتی ہے اس کے حقوق بدستور قائم رہیں گے اور اسی اصول کے تحت فلسطین برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔

اس اعلان سے مقصود یہ تھا کہ فلسطین میں عرب و یہود دونوں کی ملی جلی آبادی کی حکومت قائم کی جائے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ یہود و عرب کے درمیان نفرت و اختلاف اب بہت زیادہ ہو گیا تھا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر ان دونوں کا اجتماع مشکل تھا۔

بالفور اعلان سے قبل برطانیہ نے یہاں فوجی حکومت قائم کر رکھی تھی جو بہ نسبت یہودیوں کے عربوں کی طرف زیادہ مائل تھی (کیونکہ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے برطانیہ کی بڑی مدد کی تھی) لیکن بالفور اعلان کے بعد اس پر عمل کرانے کے لئے سربراہ برٹ سمونل کو فلسطین بھیجا گیا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ غیر جانبدارانہ طریقہ سے اس مسئلہ کو طے کرے، لیکن چونکہ وہ خود یہودی تھا۔ اس لئے یہودیوں نے اس کی پزیرائی ایک یہودی گورنر کی حیثیت کی اور عربوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تولیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے اور یروشلم اور یافہ میں سخت بد امنی پیدا ہو گئی۔ بریٹ نے ۱۹۲۰ء میں ایک عام انتخاب کی کوشش بھی کی، لیکن مسلمانوں نے اس میں مطلق حصہ نہیں لیا۔ اس کے بعد لارڈ کرومر کو ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا، اتفاق سے اسی وقت کساد بازاری شروع ہو گئی جسے بہت سے یہودیوں کا دیوالہ نکال دیا، مسلمان اس کساد بازاری سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اب یہود خود ہی فلسطین چھوڑ کر چلے جائیں گے، لیکن عربوں کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی کیونکہ یہ کساد بازاری زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی دوسری طرف لارڈ پاور نے بھی استعفا دیدیا جس سے عرب بہت خوش تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں میں پھر بے چینی پیدا ہوئی اور یروشلم میں یہود و عرب نے ایک دوسرے سے لڑنا اور شہر کے امن و سکون کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

ان حالات کو دیکھ کر لارڈ پاسفیلڈ کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن بھیجا گیا تاکہ وہ فلسطین کے حالات کی تحقیق کر کے رپورٹ مرتب کرے۔ لارڈ پاسفیلڈ نے تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ دہائٹ پیپر کے نام سے شائع کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو محدود کر دینا مناسب ہوگا۔

اس رپورٹ پر یہودیوں میں ہنگامہ مچا ہو گیا اور آخر کار رمزے میکڈانلڈ کو اس کے سامنے جھک جانا پڑا۔ یہودیوں کا کہنا یہ تھا کہ ”ہم نے فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانے کے لئے کروڑوں پونڈ صرف کئے ہیں، ہم نے یہاں کی سرزمین کو سرسبز و شاداب بنا کر قابل زراعت بنایا ہے، باغات نصب کئے ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں بہا دی ہیں جدید اصول پر سائنس سے کام لیکر وہ بہ طرح کی ترقی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں، یافہ کے قریب اپنا نیا شہر ظل عفیف کے نام سے آباد کیا ہے جس میں ۵۰ ہزار یہودی آباد ہیں، بحر مردہ سے ہم پوٹاش

نکلنے کی فکر میں ہیں اور پانی سے بجلی کی قوت پیدا کر رہے ہیں اور ہم نے فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانا طے کر لیا ہے اس لئے ہم کسی روک ٹوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔“

عربوں کا کہنا یہ تھا کہ: ”فلسطین ہمارا ہے، وہاں ہماری اکثریت ہے، یہاں کی ترقی کی اسکیموں میں پچاس لاکھ پونڈ برطانیہ ان سے وصول کر چکا ہے، دس لاکھ پونڈ بندرگاہ حیضہ کی تعمیر میں انھوں نے ادا کئے ہیں اور یہودیوں کو حق حاصل نہیں کہ وہ فلسطین کو اپنا وطن بنائیں۔“

لیکن انگریزوں نے کسی ایک کی نہیں سنی اور جو کچھ انھیں کرنا تھا کیا، فلسطین کے ساتھ شرق یرون کو بھی اپنی تولیت میں لے لیا اور عبداللہ (شریف حسین کے دوسرے بیٹے) کو یہاں کا برائے نام فرمانروا بنا دیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں عمان اور عقبہ کو بھی شرق یرون میں شامل کر کے یہاں ہوائی اڈے بنائے۔

یہ تو سب کچھ ہوا اور برطانیہ و فرانس نے اپنی تولیت کے قیام کے لئے بہت کچھ بندوبست کر لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شام و فلسطین دونوں جگہ تولیت ناکام ثابت ہوئی اور اس کا تنہا سبب یہ تھا کہ شام میں فرانسیسیوں نے عیسائی اقلیت کا اور فلسطین میں برطانیہ نے یہود اقلیت کا ساتھ دیا۔

انگریزوں نے شریف حسین اور اس کے خاندان والوں میں عرب کا ہٹوارہ کر کے یہ سمجھا تھا **سعودی عرب** کہ چونکہ یہ خاندان نبوت سے ہیں اس لئے اہل عرب مطمئن ہو جائیں گے اور اس خاندان

کی وساطت سے وہ ان پر قابو پا سکیں گے، لیکن نتیجہ توقع کے خلاف نکلا، کیونکہ شریف حسین قطعاً حکومت کا اہل ثابت نہیں ہوا اور اس نے اہل حجاز کو سخت ہریم کر دیا، اس نے حجاز میں قدیم انداز کی ملوکیت قائم کر کے سب کچھ اپنے ہی لئے مخصوص کر لیا، ملازمین کو تنخواہیں بھی بروقت نہ دیتا تھا، اور آمدنی کا ایک ایک پیسہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر جو چاہتا تھا صرف کرتا تھا، غریب کو پورا راشن بھی نہ دیتا تھا اور بد نظمی کا وہ عالم تھا گویا یہاں کسی کی حکومت ہی نہیں ہے، ان حالات کے تحت حجاز کی رعایا بہت پریشان تھی اور ہر بھی کے آثار ہر جگہ نمایاں تھے۔ اس سے قبل عرب کے وسطی حصہ میں وہابی تحریک شروع ہو گئی تھی جو ترکی کی خلافت کو تسلیم نہ کرتی تھی۔

یہ تحریک اس قدر مقبول ہوئی اور عربوں نے اس کا اتنا ساتھ دیا کہ حجاز کے دونوں مقدس مقامات مکہ اور مدینہ پر بھی وہابیوں کا قبضہ ہو گیا اور عبدالعزیز وہابی لیڈر نے نجد کی فرمانروائی کا اعلان کر دیا۔ لیکن ۱۸۸۵ء میں اسے ترکوں نے نکال باہر کیا۔ اس وقت اس کے بیٹے ابن سعود کی عمر ۱۵ سال کی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ یہ بھی خلیج فارس میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، بیس سال کی عمر میں اس نے خلیج فارس کو چھوڑا اور چھوٹی سی جماعت کے ساتھ نجد کے پائے تخت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھی اور دس سال کے اندر اس کی قوت اتنی ہو گئی کہ ترکی حکومت کو تشویش پیدا ہو چلی اور اس نے شریف حسین

کو مدد دے کر، ابن سعود کے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ شریف حسین نے ابن سعود کے بھائی کو گرفتار کر لیا اور اسے مجبور کیا کہ ترکی حکومت کی سیادت کو تسلیم کرے اور ایک سہزار پونڈ تاوان ادا کرے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے اور یہی ابتدا تھی شریفی خاندان اور وہابی جماعت کی مخالفت کی جواب تک چلی جا رہی ہے۔

ابن سعود کے متبعین زیادہ تر خانہ بدوش قبائلی لوگ تھے جن کی معاش کا انحصار صرف لوٹ مار پر تھا اور وہ کسی ایک جگہ جمکر نہ رہتے تھے، ابن سعود نے وہابی تحریک کے سلسلہ میں یہ بھی کوشش کی کہ ان قبایل کی قزاقانہ عادت کو ترک کرایا جائے، چنانچہ اس نے ایک ادارہ انجمن کے نام سے قائم کر کے ان لوگوں کو اسکا ممبر بنایا اور صلح و فساداری لیکر ان کی فوجی تنظیم شروع کر دی۔ ان لوگوں کو اس پر بھی آمادہ کیا گیا کہ وہ صحرائے عرب کے شاداب مقامات میں مستقل سکونت اختیار کر کے کاشت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس تحریک میں ابن سعود کو بہت کامیابی ہوئی اور چند دن میں وہابیوں کی قوت بہت بڑھ گئی۔

۱۹۱۳ء میں ابن سعود نے ترکوں سے بدر لینے کے لئے ہاتھ پر قبضہ کر لیا اور وہابی حکومت خلیج فارس تک وسیع ہو گئی۔ اس کے بعد جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اتحادیوں نے پانچ ہزار پونڈ ماہوار کی رشوت دیکر ابن سعود کی غیر جانبداری خریدی اور شرط یہ قرار پائی کہ شریف حسین کو جو مدد دی جا رہی ہے وہ وہابی حکومت کے خلاف استعمال نہ کی جائے۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں شریف حسین نے اس عہد کو توڑ کر وہابیوں کے شہر خرمہ پر قبضہ کر لیا۔ ابن سعود نے چند دن بعد ہی اچانک حملہ کر کے پھر خرمہ کو چھین لیا اور حسین کے بیٹے عبداللہ کو بھی گرفتار کر لیا جو بعد میں قید سے بھاگ نکلا۔

۱۹۱۶ء میں ابن سعود نے پھر اپنی تاخت کا سلسلہ شروع کیا اور عراق کی حدود تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا۔ اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ وہابیوں سے گفتگوئے مصالحت ضروری ہے اور اس غرض سے سے کویت میں کانفرنس طلب کی گئی۔ لیکن باہم کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ ابن سعود نے برطانیہ کی اس پالیسی کو پسند نہ کیا کہ عراق، حجاز اور شرق اردن میں شریفی خاندان کے افراد کو حکمران بنایا جائے، دوسری طرف برطانیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ابن سعود عراق کے حدود تک پہنچ جائے۔

۱۹۲۰ء میں جب مصطفیٰ کمال نے منصب خلافت کو منسوخ کیا تو شریف حسین نے اپنے بیٹے عبداللہ کے اصرار سے اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ نے ابن سعود اور شریف حسین دونوں کو امداد دینا بند کر دی تھی۔ ابن سعود نے شریف حسین کا اعلان خلافت سنکر تین طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ شرق اردن اور عراق میں تو خیر اسے کامیابی نہ ہوئی اور برطانیہ کی ہوائی فوج نے بم گرا کر ابن سعود کے شترسواروں کو تتر بتر کر دیا، لیکن جدہ کی طرف علی کی فوج کو شکست دیکر اس نے مکہ پر قبضہ کر لیا۔ اس

فتح کے بعد جب ابن سعود مکہ میں داخل ہوا تو اس کا داخلہ فاتح کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ ایک احرام بند زائر کی حیثیت تھا اس کا اثر لوگوں پر بہت ہوا اور کہا جاتا ہے کہ سالہا سال کے بعد پہلی بار ابن سعود ہی کے زمانہ میں امن و سکون کے ساتھ لوگوں کو حج کرنا نصیب ہوا۔

اب ابن سعود، نجد و حجاز دونوں کا مالک تھا، لیکن ان دونوں مقامات میں دیرینہ قبائلی عداوت کو دور کرنا آسان نہ تھا۔ وسطی ریگزار عرب کے باشندے جو وہابی اصول کے پابند تھے، اول تو یونہی حجازیوں کے سخت دشمن تھے اور دوسرے وہ یہ دیکھتے تھے کہ مکہ میں ہر چہار طرف سے حجاج آتے ہیں اور آزادی کے ساتھ وہاں ممنوعات کا استعمال ہوتا ہے جو ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ اس لئے نجد کے قبائل بیتاب تھے کہ حجاز پر حملہ کر کے وہاں کے قبائل کو نکال دیں، لیکن ابن سعود نے اپنے قبائل کے جذبات کو بڑی تدبیروں سے دبایا اور اسی دوران میں اس نے جدہ سے مکہ تک ریل اور موٹر سروس جاری کر دی، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں جتنے حجاج مکہ میں جمع ہوئے اس سے قبل کبھی نہ جمع ہوئے تھے۔ لیکن جماعت اخوان اب تک برہم تھی اور ابن سعود کے متعلق کہتی تھی کہ وہ وہابی اصول سے ہٹ گیا ہے اور عرب میں موٹریں چلا کر اور وائٹس قائم کر کے اصول مذہب سے منحرف ہو گیا ہے۔ ابن سعود نے نجد کے سرداروں کو بلا کر بہت کچھ سمجھایا لیکن وہ نہ مانے اور بغاوت کر کے حدود عراق پر حملہ کر دیا۔

برطانیہ نے عراقیوں کی مدد کر کے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا اور جب یہ نجد واپس آئے تو ابن سعود نے ان کے بہت سے لیڈروں کو قتل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجد و حجاز ایک ہو گئے اور ابن سعود کی حکومت بحر احمر سے لیکر خلیج فارس تک اور بحر ہند سے صحرائے شام تک قائم ہو گئی۔ اب اس کے لئے خطرہ کی چیر صرف وہ علاقہ تھا جو شمال میں برطانیہ کے زیر اقتدار تھا۔ اس لئے ۱۹۳۱ء میں اس نے شرق اردن اور عراق کے درمیان کا علاقہ بھی لینا چاہا، لیکن برطانیہ اسے کسی طرح گوارا کر سکتا تھا کیونکہ فلسطین سے خلیج فارس کا راستہ اسی طرف سے تھا اور اس کی پائپ لائن بھی یہیں کبھی ہوئی تھی۔ آخر کار ابن سعود کو مجبوراً یہ خیال ترک کرنا پڑا اور اسے شرق اردن میں عبداللہ سے اور عراق میں فیصل اور فیصل کے بیٹے سے صلح کرنا پڑی۔

اس کے بعد صرف جنوبی حصہ ایسا رہ گیا تھا جہاں وہ کامیاب ہو سکتا تھا اس لئے ابن سعود نے ۱۹۳۲ء میں یمن پر حملہ کر کے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

پھر چند برطانیہ نے بہت کوشش کی کہ سعودی عرب کو بھی اپنی تولیت میں لے لے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوا اور اب سرزمین عرب میں تنہا ابن سعود ہی کی حکومت ایسی ہے جو اپنے آپ کو صحیح معنی میں خود مختار و آزاد کہہ سکتی ہے اور بیرونی ممالک کے اثر سے بالکل پاک ہے۔

ابن سعود کے تعلقات اب امریکہ سے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور اس نے اپنے ہاں کے پٹرولی چشموں کا ٹھیکہ امریکن کمپنی کو دے رکھا ہے جس سے اس کو لاکھوں پونڈ کی آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ جن ترکیبوں سے کام لے رہا ہے، وہ بڑی شاطرانہ ہیں، وہ آہستہ آہستہ یہاں پوری طرح چھایا جا رہا ہے اور ابن سعود ڈالروں کی لالچ کی وجہ سے اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ امریکہ کے موجودہ درگھوڑی وہبہ سے ایک نیا دن امریکہ کی کالونی بن جانا ہے اور اس کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے سلب ہو جانا۔

عراق جنگ عظیم سے قبل عراق کو کوئی بین الاقوامی خصوصیت حاصل نہ تھی۔ دوران جنگ میں سب سے پہلے دنیا کی توجہ اس کی طرف اس وقت مبذول ہوئی جب برطانوی جنرل ٹاؤن شینڈ کو ترکوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور اس کے بعد اُس وقت جب مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانوی فوج کے ہاتھ آیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں بصرہ، بغداد اور موصل کے علاقے بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس وقت یہاں کی آبادی ۲۰ لاکھ عراقیوں، ۵ لاکھ کردوں اور ڈھائی لاکھ اسیروں عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ ترکوں کا یہاں اب کوئی اثر باقی نہ رہا تھا اور برطانیہ نے کرنل اے ٹی ولسن کی تجویز کے مطابق برطانوی افسروں کے ذریعہ سے یہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، لیکن چونکہ وائٹ ہال کی پارٹیوں میں عراق کے مستقبل کے متعلق اختلاف تھا، اس لئے کوئی خاص پالیسی اس باب میں متعین نہ ہوئی تھی۔

خود عراقیوں کے ذہن میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی واضح صورت نہ تھی، لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد وہ کسی اور حکومت کی غلامی میں نہ دیدہئے جائیں۔

ولسن یہ چاہتا تھا کہ عراق، برطانیہ کی تولیت میں آجائے۔ اس نے لکھا تھا کہ ”اگر ہم کو عرب کے متعلق اپنی پالیسی کو کامیاب بنانا ہے تو ہم کو ان سے سیاسی تعلقات استوار کر کے اپنی تجارتی پالیسی کو مضبوط بنانا چاہیئے۔“

ولسن کا مقصد یہ تھا کہ عراق کو ترقی دیکر وہ اقتصادی، تعلیمی اور صنعتی حیثیت سے یورپ کی سطح پر لے آئے، عربوں کے قبائلی نزاعات کو دور کر کے انھیں متحد و متفق کر دے، لیکن یہ کوئی آسان بات نہ تھی، اور اس کے لئے بڑا زمانہ درکار تھا، تاہم اس نے بارہ مہینے تک اس تجویز میں سرکھپایا اور اسی قلیل مدت میں برطانیہ کے ۳ کروڑ پونڈ صرف ہو گئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر کار ۱۹۲۰ء ولسن واپس بلا لیا گیا۔

اس کے بعد جب بغداد میں یہ اعلان کیا گیا کہ عراق برطانیہ کی تولیت میں رہے گا، تو یہاں بغاوت شروع ہو گئی، کیونکہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کسی اور کی غلامی قبول نہ کر سکتے تھے۔ اس ہنگامہ میں بہت

برطانوی افسران مارے گئے اور علاقہ فرات کا درمیانی حصہ برطانیہ کے قابو سے باہر ہو گیا۔
کرنل لارنس نے ایک خط کے ذریعہ سے ۲۲ جولائی ۱۹۱۷ء کے ٹائمز میں ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے
لکھا تھا کہ :-

”دو سال کا انتظار کرنے کے بعد عراقیوں کے پیمانہ صبر کا لبریز ہوجانا تعجب کی بات نہیں۔ جو حکومت ہم نے
یہاں قائم کی ہے وہ انگریزی وضع کی ہے اور انگریزی زبان ہی میں وہ کام کرتی ہے۔ ۴۵۰ افسران میں
سے ایک بھی عراق کا باشندہ نہیں۔ ترکوں کے زمانہ میں ۷۰ فی صدی افسران عراق ہی کے تھے ہماری ۸۰ ہزار فوج
صرف فرایض پولیس ادا کرتی ہے اور سرحد کی حفاظت و نگرانی نہیں کر سکتی۔ ترکوں کے عہد میں یہاں کی فوج
میں عربی افسر ۲۰ فی صدی تھے اور ۹۵ فی صدی دوسرے فوجی عہدہ دار بھی عرب ہی تھے، لیکن انگریزوں
نے ان سب کو نکال دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور عراقیوں میں برطانیہ کے خلاف بغلانی پیدا ہو گئی“

جولائی اور اکتوبر کے درمیان، عراقیوں سے جنگ کرنے میں دو ہزار برطانوی اور ہندوستانی افسران
کام آئے اور ۸۴۵۰ عرب مارے گئے۔ اس خلفشار اور بد امنی کے دور کرنے کی صرف ایک ہی تدبیر تھی اور یہ
کہ حکومت کا ذمہ دار زیادہ تر عربوں کو قرار دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اکتوبر میں کرنل ولسن کی جگہ سرپرسی کاکس بھیجے گئے، انھوں نے بغداد میں سربراہ اور وہ عراقیوں کو بلا کر کاہنہ
بنانے کی ہدایت کی اور اس طرح تیرہویں صدی کے بعد سب سے پہلے عراقیوں کو ذمہ دار حکومت تفویض ہوئی۔
لیکن سچ بوجھتے تو یہ حکومت پھر بھی برطانیہ ہی کی تھی کیونکہ اہم معاملات کا فیصلہ اس نے خود اپنے ہی ہاتھ
میں رکھا تھا۔

۱۹۱۷ء میں جب قاہرہ کانفرنس منعقد ہوئی تو استعماری سکریٹری ولسٹن چرچیل نے یہ فیصلہ کیا کہ عراق
سے برطانوی فوج ہٹالی جائے اور اس کی جگہ ہوائی فوج رکھی جائے۔ اس سے منشاء یہ تھا کہ فوجی مصارف تو
کم ہو جائیں لیکن دباؤ پہلے سے زیادہ بڑھ جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ یہاں کوئی بادشاہ مقرر
کیا جائے، اس کے انتخاب میں بھی برطانیہ اور عراق کے درمیان کافی اختلاف رہا، لیکن آخر کار شریف فیصل
کی سیادت عراقیوں نے منظور کر لی۔

شریف فیصل فیصل کی تمام زندگی مصائب ہی میں بسر ہوئی تھی، وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ سلطان عبدالحمید
کے زمانہ میں مقید کر کے قسطنطنیہ بھیجا گیا، اور پھر حجاز میں عرصہ تک مقید رہا۔ اس کے
بعد عرب بغاوت کی قیادت میں سرگرداں رہا اور آخر آخر جب دمشق کی حکومت اسے ملی تو فرانسیزیوں نے اسے
نکال دیا۔ اب عراق کی حکومت ملی تو اس کی پوزیشن اور زیادہ نازک ہو گئی، ایک طرف تو عراقی رعایا اس سے

بظن تھی کیونکہ وہ برطانیہ کا نامزد شخص تھا، دوسری طرف شام میں فرانسیسی پڑوسی اس سے برہم تھا کیونکہ دمشق سے اس نے اس کو نکالا تھا، پھر چونکہ وہ سنی تھا اس لئے ایرانی بھی خوش نہ تھے اور اپنے مقامات مقدسہ ایک سنی کے ہاتھ میں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ شریفی خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ابن سعود سے اس کی دشمنی پہلے ہی سے تھی، الغرض عراق کا بادشاہ ہونے کے بعد فیصل کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی لیکن چونکہ وہ آدمی تھا بڑے صبر و استقلال کا اس لئے اس نے ان تمام مشکلات پر آہستہ آہستہ قابو پا لیا۔

فیصل کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب وہ اپنی حکومت کا اعلان کرے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دے کہ اقتدار اعلیٰ برطانوی ہائی کمشنر کا رہے گا، لیکن فیصل نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ: ”حسب معاہدہ برطانیہ نے مجھے خود مختار فرمانروا تسلیم کیا ہے اور اس کے خلاف میں کوئی اعلان نہ کروں گا۔“

آخر کار ۱۹۳۲ء میں ایک مزید معاہدہ کی رو سے برطانیہ نے اسے عراق کا خود مختار فرمانروا تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۲ء میں شام کی فرانسیسی حکومت نے بھی اس کی یہ حیثیت مان لی اور شام و عراق کے درمیان سلسلہ تجارت قائم ہو گیا۔ ایرانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے بغداد سے تہران تک سڑک بنوا دی، اور ایران سے بھی معاہدہ ہو گیا۔

اب صرف ابن سعود رہ گیا تھا جس سے صلح و آشتی کے تعلقات قائم کرنا مشکل تھا، لیکن فیصل برابر اس کوشش میں لگا رہا اور آخر کار ۱۹۳۲ء میں وہ خود ابن سعود سے ملا اور اس طرح آپس کے تعلقات میں جو تلخی پائی جاتی تھی وہ بہت کم ہو گئی۔

موصل موصل کی زیادہ تر آبادی کردوں پر مشتمل ہے اور اسی لئے جنگ کے بعد بھی ترکوں کا یہ اصرار باقی رہا کہ موصل کو ترکی حکومت میں شامل رہنا چاہئے۔ جمہوریت ترکی کا ارادہ یہ تھا کہ موصل کے ۵ لاکھ کردوں کو اُن ۳۰ لاکھ کردوں کے ساتھ ملا دے جو کوہستان زونغا کے شمال میں آباد ہیں اور اس طرح پورے کردستان کو اپنی قلمرو میں شامل کر لے۔ لیکن اتحادیوں نے چاہتے تھے کہ شمالی کردستان کو علیحدہ ایک مستقل حکومت بنا دیا جائے اور اگر موصل کے کرد آبادی چاہے تو اس حکومت میں شامل ہو جائے۔ لیکن جب اتحادیوں اس میں کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے اپنی پالیسی بدل کر یہ ظاہر کیا کہ موصل کا عراق کی حکومت میں شامل رہنا ضروری ہے۔ کردوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری کیونکہ عراقیوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ سے خراب رہے تھے اور انھوں نے اس تحریک کا مقصد بلکہ بھی کیا، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے اور آخر کار موصل، عراق کو دینا طے پا گیا۔

پہلے ۱۹۷۶ء میں یہ صوبہ فرانس کو دینا تجویز ہوا تھا اس لئے شام کی فرانسیسی حکومت نے اس تجویز کی مخالفت کی، لیکن آخر کار اس نے بھی اسے تسلیم کر لیا، اس شرط کے ساتھ کہ یہاں کے پٹرولی چشموں کی آمدنی سے ایک چوتھائی اسے دیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد ایک کروڑ پونڈ کے سرمایہ سے عراق پٹرول کمپنی وجود میں آئی اور حیفہ سے طرابلس تک پائپ لائن بچھا دی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی حکومت اقتصادی حیثیت سے برطانیہ و فرانس کی دست دگر ہو گئی اور اب ہر وقت اس اندیشہ سے دوچار ہے کہ بہ صورت بد امنی مغربی طاقتیں اپنے اپنے سرمایہ کی حفاظت کے بہانہ سے فوراً اپنی فوجیں یہاں بھیج کر قبضہ کر لیں گی۔

انقلاب حیدرآباد کی داستان پر پہلی کتاب

”مشاہدات“

یعنی
حضرت ہوش بگرامی

(المخاطب بہ نواب ہوشیار جنگ بہادر)

کے خود نوشتہ سوانح زندگی جو نہ صرف اپنی بلند انشاء بلکہ سیاسیات و مذہبیات پر بھی ایک بے لاگ حکیمانہ تبصرہ کے لحاظ سے اپنے رنگ کی بالکل پہلی کتاب ہے۔ جناب ہوش کی عمر کا بڑا حصہ ریاستوں ہی میں بسر ہوا ہے اور ان کی پالٹکس کو مشکل ہی سے کسی نے ان سے بہتر سمجھا ہوگا۔ یونٹو اس میں رام پور، بھوپال، گوالیار، ادے پور، الور، جے پور وغیرہ متعدد ریاستوں کے دلچسپ حالات نظر آتے ہیں، لیکن کتاب کا وہ حصہ جو ”ریاست حیدرآباد اور اس کے انقلاب“ سے تعلق رکھتا ہے، دیکھنے کی چیز ہے، کیونکہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد ہی حیدرآباد کی تاریخ انقلاب پیش کرنا تھا۔

جناب ہوش ایک چوتھائی صدی سے حیدرآباد کی پالٹکس اور دربار عثمانی کے رجحانات کا مطالعہ کر رہے تھے اور نظام کے یہاں ہر وقت کی حضوری کی وجہ سے وہاں کی ان تمام اندرونی سازشوں اور ریشہ دواہیوں سے واقف تھے جو کسی دوسرے کے علم میں آ ہی نہ سکتی تھیں۔ رضا کار تحریک، ارباب حکومت کی سازشیں، سچے مشیروں کی مشکلات، دربار عثمانی کے حیرناک حالات، سیرت نظام کی عجیب غریب خصوصیات، پولیس ایکشن کی داستان، اور اسکے بعد نظام اور اہل ملک پر اس کا ردِ عمل۔ اگر آپ ان تمام واقعات کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو ”مشاہدات“ ملاحظہ فرمائیے۔

کاغذ ولایتی۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ ۱۰ تصاویر۔ نفیس جلد۔ قیمت دس روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

مصر

برطانوی شہنشاہیت نے جس چالاکي و ہوشیاری سے مصر میں آہستہ آہستہ اپنے پاؤں جمائے ہیں اس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مصر کے ساتھ برطانیہ کی دلچسپی سب سے پہلے اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب نیولین اول نے برطانیہ کے مشرقی ذرائع آمد و رفت کو دریائے نیل کی طرف سے خطرہ میں ڈال دیا تھا، لیکن جب نیولین سوم کے عہد میں نہر سویز طیار ہوئی تو یہ دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

ہر چند یہ کمپنی فرانس کی تھی لیکن ہر ملک اس کے حصے خرید سکتا تھا اور چونکہ اس کا تعلق سرزمین مصر سے تھا اس لئے اصولاً چاہئے یہ تھا کہ مصر ہی اس میں زیادہ حصہ لیتا، لیکن خدیو مصر کے پاس روپیہ نہ تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ نے نصف سے زیادہ حصے خرید لئے اور اس مالی تعلق کے پیدا ہوجانے کی وجہ سے مصر پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اتفاق سے اس کے بعد ہی عربی پاشا نے خروج کیا اور برطانیہ کو فوجی تسلط قائم کرنے کا بھی بہانہ ہاتھ آگیا۔ لیکن یہ تسلط جس ہوشیاری سے ۲۲ سال تک قائم رکھا گیا وہ برطانوی سیاست دانی کی بڑی زبردست چال ہے۔

مصر، سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا اور خدیو مصر اس کا ماتحت تھا، لیکن انگریزوں نے اس تعلق کی اہمیت کو کبھی چیلنج نہیں دیا بلکہ اس کو بدستور قائم رکھنے کی کوشش کی تھے کہ جو انگریز خدیو مصر کی ملازمت میں تھے انہوں نے انگریزی ٹوپی بھی اتار چھینکی اور ترکی ٹوپی پہننا اختیار کیا۔ فوج کی ملازمت میں انہوں نے پاشا کا لقب اختیار کرنا منظور کر لیا اور مصریوں کے ساتھ ایسے کھل مل گئے گویا وہ مصر ہی کے اصل باشندے تھے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ سلسلہ برابر ۲۲ سال تک جاری رہا یہاں تک کہ سلامۃ کی جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ کو اپنا نقاب دوستی اتار چھینکنے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چونکہ اس جنگ میں ترکی، اتحادیوں کے خلاف تھا اس لئے دسمبر ۱۸۸۰ء میں برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ ”مصر ہر مجبئی کی حفاظت میں لے لیا گیا ہے اور آئندہ وہ برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔“ لیکن اس کے بعد بھی برطانیہ نے اپنی پالیسی کو گول مول ہی رکھا اور ظاہر یہی کیا کہ مصر خود مختار ہے،

چنانچہ خدیو کا لقب بدل کر سلطان کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ موجودہ تولیت عارضی ہے اور صرف جنگ کے زمانہ تک محدود رہے گی۔

ہر چند مصر کو اتحاد میں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی اور اس کی حیثیت ایک غیر جانبدار ملک کی سی تھی، لیکن جیسا کہ لارڈ لائیڈ نے ظاہر کیا تھا دراصل وہ نہ نیوٹرل تھا اور نہ لڑائی میں شریک، اس کی حیثیت ایک فوجی کمپ کی سی تھی، جہاں اتحادی فوجوں کا زبردست اجتماع رہتا تھا اور مصریوں کے تمام ذرائع پیداوار و ترقی یا تو اتحادیوں کے تصرف میں تھے یا بالکل معطل اور ان کا مستقبل بالکل برطانیہ کے رحم و کرم پر منحصر تھا۔ اگر مصر واقعی صحیح معنی میں نیوٹرل رہتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن ہوا یہ کہ مصر کو شرکت جنگ میں دعوت نہ دینے کے باوجود اس کے فوجی دستوں کو ترکوں کے خلاف استعمال کیا گیا، وہاں کے ہزاروں غریب کاشتکاروں کو زبردستی بھرتی کر کے میدان جنگ کے طرف بھیجا گیا، اس لئے دریائے نیل کا سارا علاقہ مارشل لا کے تحت آ گیا، دولاکھ اتحادی فوجوں کے لئے پانی اور لکڑی لانے کے لئے مصر ہی کے غریب کاشتکاروں کو مجبور کیا گیا، غلہ اور روٹی کی تمام پیداوار نہایت معمولی قیمت دیکر لے لی گئی، اور مصر کے تمام خچر اور اونٹ فوج کے لئے زبردستی حاصل کئے گئے۔

ان حالات میں مصری قوم کی پریشانیوں اور بے چینیوں کا جو عالم رہا ہوگا، ظاہر ہے، اس کے بعد جب لڑائی ختم ہوئی اور ولسن نے شرائط صلح کے لئے اپنے بارہ نکات پیش کئے تو مصر کو کچھ امید قائم ہوئی کہ غالباً وہ آزاد ہو جائے گا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صلح کانفرنس میں اس کو شرکت کی اجازت نہیں مل سکتی، حالانکہ حبشہ اور حجاز کے نمائندوں کو اس کی اجازت مل گئی تھی۔

اس واقعہ سے مصریوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ سمجھ گئے کہ برطانیہ کا ارادہ مصر کے باب میں کیا ہے، چنانچہ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ زاعلول پاشا کی سیادت میں وفد پارٹی قائم ہوئی اور مصر کی مکمل آزادی کا مطالبہ شروع ہوا۔ اس کا جواب برطانیہ نے یہ دیا کہ زاعلول پاشا اور اس کے دو ساتھیوں کو مارچ ۱۹۱۷ء میں جلاوطن کر دیا۔ اس واقعہ سے قوم پرستوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور انھوں نے تشدد کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا، قاہرہ کے چاروں طرف ریل، تار اور سڑکوں کا سلسلہ تباہ و برباد کر کے، قاہرہ کو گویا ساری دنیا سے تعلق کر دیا۔ سوڈان ریوے کو بھی متعدد جگہ نقصان پہنچایا۔ گویا اس سلسلہ میں عام عوام نہ ہی نہیں ہوئی پھر بھی کہیں کہیں مصریوں کے جذبات زیادہ مشتعل ہو گئے اور اس سلسلہ میں کچھ انگریزوں کی جانب بھی تلف ہوئیں۔ اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ معاملہ زیادہ سنگین ہے اور اس نے لارڈ ایلن ہیری کو ہنگامہ فرو کرنے کے لئے مامور کیا۔ انھوں نے مصر آکر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت سے متعلق نہیں ہے بلکہ ساری

مصری آبادی کے جذبات مشتعل ہو چکے ہیں اور طلبہ، وکلاء، اخبار نویس اور چھوٹے بڑے طبقہ کے تمام افراد اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ اس نے ان حالات کے پیش نظر مصر کے لیڈروں کو بلا کر ان سے قیام امن و سکون کی اپیل کرنا مناسب سمجھا۔ اس مشورہ میں زاغلول پاشا کو بھی بلا کر شریک کیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تشدد کی پالیسی کو تو مصر نے ملتوی کر دیا، لیکن اس کی جگہ اسٹریک، پکٹنگ وغیرہ شروع کر دی۔ برطانیہ نے اب ایک کمیشن لارڈ ملز کی سرکردگی میں مصر کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے مامور کیا اور اسے جو رپورٹ پیش کی اس سے برطانیہ کو معلوم ہوا کہ جب تک تولیت نہ اٹھ جائے گی، مصریوں کو اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ لیکن تولیت کا اٹھنا لینا اور مصر کا آزاد و خود مختار ہونا دو جدا چیزیں تھیں۔ اور زاغلول کا مطالبہ مکمل آزادی ہی کا تھا، اس لئے زاغلول کو پھر جلا وطن کر دیا گیا اور فروری ۱۹۵۷ء میں برطانیہ اور مصر کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانیہ نے اپنی تولیت تو ختم کر دی، لیکن اور شرطیں ایسی لگا دیں کہ مصر کے ہاتھ بدستور بندھے رہے۔ مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ مصر میں غیر ملکوں کے مفاد اور اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ برطانیہ کے ہاتھ میں رہے گا، دوسرے یہ کہ مصر سہ بیرونی حملہ کی صورت میں برطانیہ مدافعت کرے گا، تیسرے یہ کہ سوڈان کا مسئلہ بالکل علیحدہ متصور ہوگا۔ اور چوتھے یہ کہ برطانیہ کے ذرائع مواصلات جو مصر سے تعلق رکھتے ہیں ان کی حفاظت بھی برطانیہ ہی کرے گا۔

پھر کہنے کو تو یہ معاہدہ ہو گیا، لیکن مصر و برطانیہ کی نزاع اس سے ختم نہیں ہوئی، کیونکہ ان شرائط میں سے بعض کی توضیح و صراحت مصر کو تسلیم نہ تھی۔ مثلاً لارڈ لائیڈ کا کہنا یہ تھا کہ ”برطانوی ذرائع مواصلات سے صرف نہر سوئز ہی مراد نہیں ہے بلکہ ہندوستان، آسٹریلیا، ایران، عراق اور چین تک پہنچنے والے خشکی، تری اور ہوا کے تمام راستے اور ذرائع مواصلات اس میں شامل ہیں۔“

مصر اس کے تسلیم کرنے کے لئے طیار تھا کہ ان ذرائع مواصلات کی حفاظت برطانیہ کے لئے ضروری ہو لیکن وہ یہ ماننے کے لئے طیار نہ تھا کہ حفاظت کی یہ خدمت مصر سے چھین کر خود برطانیہ اپنے ہاتھ میں لے۔ سوڈان کے معاملہ میں بھی مصر، برطانیہ سے متفق نہ تھا، سوڈان بڑی وسیع سرزمین ہے اور دریائے نیل کا منبع و مخرج ہے، اس لئے مصر کی آبپاشی بالکل سوڈان پر منحصر ہے۔ مصر کا کہنا یہ ہے کہ نہر سوئز پر اقتدار کے باب میں برطانیہ جو دلیل پیش کر سکتا ہے، وہی دلیل سوڈان کے باب میں مصر کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے کیونکہ مصر کی تمام اقتصادیات سوڈان پر منحصر ہیں۔ علاوہ اس کے مصریوں کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ مصر و سوڈان کی آبادی ایک ہی مذہب، ایک ہی زبان، ایک ہی کلچر رکھتی ہے اور محمد علی پاشا بانی خیرطوم کے زمانہ میں مصر و سوڈان ایک ہی مملکت میں شامل تھے۔

اس کا جواب برطانیہ یہ دیتا ہے کہ سوڈان کو برطانیہ ہی نے ہمدردیوں سے چھینا تھا، پھر اس کے بعد ریلوں اور بندرگاہوں کی تکمیل و تعمیر اور رونی کی پیداوار بڑھانے میں برطانیہ نے بہت صرف کیا ہے اس لئے سوڈان پر ان کا بھی مصر کے برابر حق ہے۔

بہر حال مصر و برطانیہ کا یہ اختلاف ۱۹۵۶ء سے برسرِ چلا آ رہا ہے اور آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔ فواد کی تخت نشینی کے بعد جب مصر کی نئی کابینہ میں زاعلول پھر وزیر اعظم کی حیثیت سے مامور ہوئے تو اکثریت اس کے ساتھ تھی اور اگر برطانیہ، زاعلول پاشا پر اعتماد کر کے اپنا نقطہ نظر دوستانہ انداز میں اس کے سامنے پیش کرتا تو بہت ممکن ہے کہ مصر کا جھگڑا طے ہو جاتا، لیکن برطانیہ نے زاعلول کو ہمیشہ ایک باغی و انقلابی کی حیثیت سے دیکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کی قومی تحریک نے زیادہ تشدد آمیز صورت اختیار کر لی اور قتل و خونریزی کے واقعات بھی پیش آنے لگے، یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں سوڈان کا گورنر جنرل مارڈال لایا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زاعلول کو استعفا دینے پر مجبور کیا گیا اور شاہ فواد نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جب ۱۹۵۶ء میں عام انتخاب ہوا تو زاعلول کی وفد پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ لیکن برطانوی ہائی کمشنر نے پھر زاعلول کی مخالفت کی اور وہ کابینہ میں نہ آسکا۔ آخر کار ۱۹۵۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور سارے مصر نے اس کا ماتم کیا۔

زاعلول کی وفات کے بعد مصطفیٰ نجاس نے وزارتِ قائم کی جو قوم پرست جماعت کے افراد پر مشتمل تھی اس لئے برطانیہ اور مصر کے تعلقات بدستور کشیدہ رہے۔ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ کی لیبر حکومت نے مصر سے نیا معاہدہ کیا جس کی رو سے مصر کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ لڑائی کے زمانہ میں برطانیہ، مصر کی سرزمین پر اپنی فوجیں جمع کر سکے گا۔ برطانوی ہائی کمشنر کا عہدہ بھی منسوخ کر دیا گیا اور سوڈان کی بابت یہ کہا گیا کہ وہ دونوں حکومتوں کے زیر اثر رہے گا۔ لیکن نجاس کی وزارت نے ان شرائط کو رد کر دیا۔ اور شاہ فاروق نے برطانیہ کی تحریک پر وزارت توڑ دی اور عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیکر تمام اختیارات اسماعیل صدیقی کو دیدئے جس نے ۱۹۵۳ء سے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ اکتوبر میں ایک نئے کانٹینیٹیشن کا اعلان کیا گیا جس کی رو سے بادشاہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جب چاہے پارلیمنٹ کو توڑ کر سینٹ کے ۱۰۰ ممبروں میں سے ۶۰ ممبروں کو نامزد کر دے۔ انتخاب ممبران کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ پبلک ہر ۵۰۰ رائے دہندوں کے لئے ایک کا انتخاب کرے، لیکن وفد پارٹی کو کوئی موقع انتخاب میں شرکت کا نہیں دیا گیا، اس کے اخبارات



کھانسی کو روکنے

اس سے آگے خطرہ ہے!

• کھانسی کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیجیے یہی کھانسی اگر
بڑھ جائے تو بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے
کھانسی کے شروع ہونے ہی سے روکنے۔

سعالمین

کی ایک ٹیکہ منہ میں دھک کر آہستہ آہستہ پوسٹے یہ صرف گلے کی
خواہش کو روکنے کی کھانسی کو دور کر لگی طبیعت کو سکون
پہنچنے کی بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں
توازن پیدا کر لگی۔ اور سانس
کو خوشگوار بنائے گی۔
قیمت فی شیشی صوبہ آئے
ہمدرد و درواخانہ وقت دہلی



کو بند کر دیا گیا، اس کے لیڈروں کو قید میں ڈال دیا گیا اور
انتخاب کے وقت سیکڑوں آدمی زخمی ہوئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
صدر قی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔

لڑائی کے بعد ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان مصر
نے بہت کمایا، روئی کی قیمت تقریباً ایک ہزار گنا بڑھ گئی اور
دس سال تک مصریوں کے پاس اتنی دولت رہی کہ وہ سیاسی
اصلاحات کے ہنگامہ کو قائم رکھ سکے، لیکن اس کے بعد چپ
کساد بازاری شروع ہوئی تو پھر یہاں ڈکٹیٹر شپ کا دور دورہ
شروع ہو گیا۔

۱۹۵۶ء تک مصر کا سوال بدستور اپنی حالت پر رہا،
نہ سوئیز پر اسے اقتدار حاصل ہوا نہ سوڈان پر۔ اور برطانوی
اثرات میں کچھ کمی بھی ہوئی تو وہ ایسی نہ تھی کہ مصر اپنے آپ کو
ایک خود مختار و آزاد حکومت کہ سکے۔

ہندوستان اور پاکستان کی تمام
کتابوں کے لیے
یونیورسٹی لائبریری ڈپو۔ محمد علی روڈ
لاہور۔

ایران کی بیداری

ایران، کبھی ترکی سلطنت کا حصہ نہیں رہا۔ لیکن ترکی کی طرح دوسری ملحقہ اسلامی حکومتوں سے اس کے بھی تعلقات بہت وسیع رہے ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایران، برطانیہ اور روس کی شاہنشاہیت کا شکار رہا اور اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ کی رو سے اس کا جنوبی حصہ برطانیہ کے زیر اثر آگیا اور شمالی حصہ پر روس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ جب ۱۹۱۴ء میں زاریت کا خاتمہ ہوا تو روس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن کو موقع مل گیا کہ ایران کو پوری طرح برطانیہ کے زیر اثر لے آئے، لارڈ کرزن کی اسکیم یہ تھی کہ خلیج فارس سے بحر کاہن (اخصر) تک تمام حصہ برطانیہ کے اقتدار میں لا کر اسے برطانوی ہند کا ایک سرحدی صوبہ قرار دیدے۔ چنانچہ جب ۱۹۱۷ء میں ترکوں کو شکست ہوئی تو برطانیہ نے ایران کے خاص خاص اہم مقامات پر اپنی فوجیں متعین کر دیں اور شاہ ایران کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ برطانیہ کے مطالبات کو تسلیم کرے۔ اس طرح ۱۹۱۹ء میں ایران سیاسی و فوجی حیثیت سے برطانیہ کے زیر اثر آگیا۔

لیکن یہ حالت عرصہ تک قائم نہیں رہی، کیونکہ ۱۹۲۵ء میں بالشویکوں نے شمالی ایران **رضا شاہ** کے صوبہ گیلان پر حملہ کر کے اسے سوویت ریپبلک میں شامل کر لیا اور مازندران کے زرخیز میدانوں پر بھی دھاوا بول دیا اور ایرانیوں کو شکست ہوئی۔

انہیں ایرانی کاسکوں کی شکست خوردہ افروں میں ایک نوجوان افسر ایسا بھی تھا جس کی پرورش مازندران کے ایک فارم میں ہوئی تھی اور جو اپنے ملک کی تباہی کو دیکھ دیکھ کر بہت متاثر ہو رہا تھا۔ یہی گمنام فوجی افسر ۱۹۲۵ء میں تہران آیا اور صرف تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے اس نے ایران کے تمام بڑے بڑے عمال کو گرفتار کر لیا اور شاہ ایران کو مجبور کیا کہ اسے سپہ سالار اور وزیر حربیہ مقرر کرے۔ اس نوجوان کا نام رضا خاں تھا۔ یہ ایران کی کاسک فوج میں جو زار کے فوجی افسروں کی نگرانی میں تھی، چند سال سے ملازم تھا۔

گورضا خاں کو نہ پہلک کی اعانت حاصل تھی اور نہ وہ کوئی منظم جماعت رکھتا تھا، لیکن محض اپنی شخصیت اور جذبہ قوم پرستی کی وجہ سے وہ کامیاب ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں وہ ایران کا وزیر اعظم ہو گیا اور شاہ ایران سیاحت یورپ کے لئے چلے گئے۔ ٹھیک یہی وہ وقت تھا جب مصطفیٰ کمال ترکی جمہوریت قائم کر کے اس کی عنان صدارت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس لئے رضا خاں نے بھی اس کے متبع میں ایران کو جمہوریت میں تبدیل کرنا چاہا، لیکن یہاں کی مذہبی جماعت نے اس کی سخت مخالفت کی اور وہ مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر چل کر ایران میں وہ انقلاب پیدا کر سکا جو ترکی میں رونما ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ایران نہ جمہوریت بن سکی اور نہ شاہنشاہیت رہی، کیونکہ شاہ ایران موجود نہ تھے۔ آخر کار ۱۹۲۵ء میں کانسی ٹیونٹ اسمبلی نے رضا خاں کو بادشاہ بنا دیا اور اس نے شاہ رضا پہلوی کے نام سے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

چار سال کے اندر رضا شاہ نے ایران کے لئے بہت کچھ کیا۔ امن و سکون کے قیام کے ساتھ ہی جاگیر دارانہ نظام کو بھی کمزور کر دیا اور برطانوی فوجوں کو بھی جنوبی ایران سے ہٹ جانے پر مجبور کیا۔ یہاں تک شط العرب کے شیخ نے بھی جو برطانیہ کی حمایت میں ایران کے ایک ٹکڑے کا خود مختار فرمانروا بنا ہوا تھا، حکومت تہران کو تسلیم کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایران اب آزاد تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں آزادی کا قیام مشکل ہے جب تک عہد حاضر کے ذرائع ترقی سے کام نہ لیا جائے۔ اس لئے رضا شاہ کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایران کو کس طرح مغربی اصول پر عمل کر کے ترقی کی راہ پر لگائے۔ وہ مغربی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی اغراض سے خالی الذہن ہو کر آئیں گے نہیں اور خود ایران کے لوگوں میں یہ اہمیت نہ تھی کہ وہ از خود ترقی کی راہیں تلاش کریں، آخر کار مجبور ہو کر نظم و نسق سلطنت میں اسے مغربی ماہرین سے کام لینا ہی پڑا۔ مالیات کا شعبہ ایک امریکی ماہر ڈاکٹر ہلپاگ کے سپرد کیا، کسٹمز کے لئے بلجیم کے ماہرین سے مدد لی اور شعبہ تعلیم میں فرانسیسی ماہرین سے۔ اس حد تک تو کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ فرانس بلجیم اور امریکہ کی سیاسی اغراض ایران سے وابستہ نہ تھیں۔ لیکن روس اور برطانیہ سے معاملہ کرنے میں اسے بڑا تردد تھا۔ ایک طرف ماوراء قاف اور ماوراء بحر اخصر کا علاقہ سوویٹ یونین میں شامل ہو گیا تھا اور بالشیوک کوشش کر رہے تھے کہ قاف سے خلیج فارس تک ذریعہ آمد و رفت قائم ہو جائے۔ دوسری طرف برطانیہ تھا جو اننگلو پرشین آئل کمپنی کا اجارہ دار تھا اور جس میں ۲۰ ہزار ایرانی ملازم تھے۔ راموز سے آبادون تک پائپ لائن ڈال لی تھی اور یہ کوشش ہو رہی تھی کہ بغداد سے تہران

تک ریل جاری ہو جائے اور ایران و ہندوستان کے درمیان ہوائی تعلق قائم ہو سکے۔
ایران کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت تھی وہ ذرائع حمل و نقل تھے، سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ایران کے ایک حصہ میں غلہ کی پیداوار پڑی سڑا کرتی تھی اور قحط کی وجہ سے لوگ مرتے رہتے تھے، اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال یہ بھی تھا کہ اگر نقل و حمل کے لئے سڑکیں یا ہوائی راستے بنائے بھی جائیں تو ان پر بیرونی اقتدار نہ ہونا چاہئے۔ رضا شاہ نے بڑی ترکیب سے کام لیا اور وہ یہ کہ برطانیہ اور روس دونوں کو انھوں نے راضی رکھنے کی کوشش کی۔ بغداد سے طہران تک ریل جاری کرنے کی جو اسکیم برطانیہ نے بنائی تھی اس کو تو رضا شاہ نے منظور نہیں کیا لیکن اس کی جگہ سڑک بنانے اور قاہرہ سے کراچی تک ہوائی راستہ قائم کرنے کی اجازت دیدی اس شرط کے ساتھ کہ ہوائی اڈے ایران کی ملکیت متصور ہوں گے، دوسری طرف روس کو اجازت دیدی کہ وہ ماسکو سے طہران تک ہوائی سروس قائم کر سکتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ ایران بحر کاہین سے خلیج فارس تک ریلوے جاری کرے گا۔ اس لائن کا آخری اسٹیشن شمال کی طرف بحر کاہین کے ساحل پر ایسی جگہ مقرر کیا گیا جو روس کے اقتدار سے باہر تھا اور جنوب کی طرف کا آخری اسٹیشن خلیج فارس کا ایک ایسا مقام تجویز کیا گیا جو برطانیہ کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔

رضا شاہ نے اس خطرناک کھیل کو بہت ہوشیاری سے کھیلا اور بغیر اپنی خود مختاری و آزادی کو صدمہ پہنچائے، روس اور برطانیہ کے صرف پر اس نے ایران کے لئے ذرائع حمل و نقل و مواصلات فراہم کر دیے۔

اقتصادی آزادی کا حصول البتہ زیادہ مشکل کام تھا، کیونکہ ایران باوجود اس کے کہ اس کی اقتصادی پوزیشن بری نہیں ہے، وہ کفیل بالذات نہیں۔ کپڑا، شکر اور مشینری سب باہر سے آتی ہے۔ کپڑے کے تو خیر پانچ کارخانے رضا شاہ نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کر دیے۔ لیکن شکر اور مشینری کے متعلق وہ کچھ نہ کر سکے۔ ایران سے جو چیزیں باہر جاتی ہیں ان میں پٹرول، قالین پھل اور افیون خاص چیزیں ہیں، لیکن وہ پٹرول کے مارکیٹ کے لئے برطانیہ کا دست نگر ہے۔ انیکلوپٹرین آئل کمپنی اسمیں شک نہیں ایران کے ریلوے میں اتنی رقم ادا کرتی ہے کہ اس کا چوتھا بھٹ اسی سے پورا ہوتا ہے، لیکن آمدنی کی یہ کوئی اطمینان بخش صورت نہیں ہے، علاوہ اس کے اہل ایران جب یہ دیکھتے ہیں کہ کمپنی اپنے مغربی حصہ داروں کو ۲۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ ہر سال تقسیم کرتی ہے تو ان کو رشک آتا ہے کہ خود ان کے حصہ میں جو کچھ آتا ہے وہ کتنا کم ہے، حالانکہ زمین اور پٹرول دراصل سب انھیں کا ہے۔

قالین اور پھلوں کی برآمد میں ایران دوسرے ملکوں کے محکمہ کڑوڑ گیری اور خصوصیت کے ساتھ روس کے رحم و کرم کا محتاج ہے۔ افیون کی برآمد بین الاقوامی میلانات حایل ہوتے ہیں۔

مجلس اقوام نے ایران سے کہا کہ افیون کے بجائے وہ دوسری اشیا بھیجے، رضا شاہ نے جواب دیا کہ وہ پوست کی کاشت میں کمی کرنے کے لئے طیار ہے، بشرط آنکہ ایران کی دوسری پیداوار محصول کڑوڑ گیری کم کر دیا جائے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

رضا خاں نے بین الاقوامی مسایل میں بھی ایران کی خود داری قائم کرنے میں بڑا کام کیا۔ ۱۹۲۱ء سے پہلے شاہ ایران کی حکومت تہران کی چار دیواری کے اندر محدود تھی، لیکن رضا شاہ نے ہر صوبہ پر اقتدار قائم کر کے صحیح معنی میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ رضا شاہ نے پارلیمنٹ بھی قائم کی، لیکن وہ ایسی ہی بیدست و پاتھی جیسے ترکی اور اطالیہ کی پارلیمنٹ۔ حکومت دراصل فوج کے بل پر کی جاتی تھی جو ستر ہزار تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی۔ رضا شاہ نے جبریت فوجی بھرتی کی تحریک شروع کی تو علماء نے اس سے اختلاف کیا لیکن جب رضا شاہ نے ان کو بہت عزت و احترام کے ساتھ ان کے لیڈروں کو پارلیمنٹ میں جگہ دیدی تو یہ مخالفت ختم ہو گئی۔

ایران کے بہترین سپاہی وہاں کے خانہ بدوش قبائل میں ملتے ہیں، لیکن رضا شاہ کے سامنے یہ مسئلہ بڑا مشکل تھا کہ وہ ان کی سپاہیانہ فوج کو بھی قائم رکھے اور ان کی لوٹ مار کی عادت کو بھی ترک کرائے۔ اس نے یہ ترکیب اختیار کی کہ ایسے قبائل کے چند خاندانوں کو تو مولشی پالنے کے لئے مخصوص کر دیا اور باقی خاندانوں کو کاشتکار بنانے کی کوشش کی اور انھیں زراعتی علاقوں میں آباد کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے قبائلی علاقوں کے چاروں طرف کاشتکاروں کو مالکانہ حقوق دیکر بسا دیا اور ان کی کافی مدد کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی و ایران کے حالات میں بہت مماثلت نظر آتی ہے مثلاً یہ کہ دونوں جگہ تنہا ایک سپاہی نے قوم میں بیداری پیدا کی غیر ملکی رعایا کو جو مراعات حاصل تھیں وہ دونوں جگہ ختم ہو گئیں، نظم و نسق میں مغربی اصول دونوں جگہ اختیار کئے گئے، پھر بھی دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ ترکی کا انقلاب ایک ایسی قوم کا انقلاب تھا جو اس سے قبل قوم کے مفہوم سے نا آشنا تھی، برخلاف اس کے ایران کا انقلاب بہت پرانی قوم کا انقلاب تھا جس میں مختلف جماعتیں شامل تھیں اور سب ملک کی آزادی و خود مختاری کے لئے کوشاں تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے قدامت پسندی کے قیود کو بہت کے ساتھ دور کیا اور رضا شاہ کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ مصطفیٰ کمال نے ترکوں کا روایتی کلچر بدلنا چاہا اور رضا شاہ نے قدیم ایرانی کلچر کو بڑی حد تک بدستور قائم رکھا۔

افغانستان

بیسویں صدی کی ابتدا میں تمام اسلامی ممالک میں مغربی تقلید اور قومیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا لیکن اس میں ہر ملک کامیاب نہیں ہوا۔ اور انھیں ناکامیاب ممالک میں افغانستان بھی تھا۔

افغانستان عرصہ سے روس و برطانیہ کے درمیان ایک بفر (B U F F E R) حکومت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس طرح اسے کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔ یعنی روس و برطانیہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ وہ حد فاصل کی حیثیت سے قائم رہے لیکن اس کو پوری طرح آزاد بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ جب ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس ہوا اور روس کی طرف کا خطرہ دور ہو گیا تو امان اللہ نے سوچا کہ اب برطانیہ کی مدد و حمایت کی ضرورت نہیں ہے اور اس بار سے بھی اس کے ملک کو آزاد ہونا چاہیے، اسی کے ساتھ چونکہ اس وقت برطانیہ، ترکی کا دشمن تھا اور مذہباً خلیفہ کا اثر افغانستان میں کافی تھا، اس لئے امان اللہ نے ۱۹۱۹ء میں ایک مہم درہ خیبر پر برطانیہ کے خلاف روانہ کی، لیکن افغانی سپاہ جس کے پاس نہ ہوائی جہاز تھے، نہ مشین گنیں، برطانوی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور آخر کار ۱۹۲۱ء میں افغانستان کو برطانیہ سے صلح کرنا پڑی۔ اسی کے ساتھ امان اللہ نے روس سے بھی معاہدہ کر لیا اور یہ سمجھ کر کہ اب وہ برطانیہ اور روس دونوں کے دست اندازی کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہے، ایران اور ترکی کی تقلید میں مغربی قسم کی اصلاحات شروع کیں۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوا کیونکہ اول تو وہ خود قومی میڈر کی حیثیت نہ رکھتا تھا اور دوسرے یہ کہ مذہبی قدامت پرستی افغانستان میں بہت زیادہ تھی اور ملاؤں کا اثر لوگوں پر بہت قوی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کے خلاف سارے ملک میں شورش پیدا ہو گئی اور ۱۹۲۹ء میں اسے معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک اضطراب و ہرجاں کا دور قائم رہا اور کوئی جم کر حکومت نہ کر سکا، آخر کار نادر شاہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اس نے ۵۰ لاکھ پونڈ نقد، دس ہزار راٹیلیں اور ۵۰ لاکھ کارٹوس برطانیہ سے قرض لیکر حکومت کو سنبھالا لیکن نومبر ۱۹۳۳ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور اس کا بیٹا ظاہر شاہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پُرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

ممبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت
باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ
ضرورت پڑنے پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے

حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرمز مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک اسٹریٹ۔ ممبئی

منشی نو لکشور کے وارث و جانشین راجہ رام کمار ہیں

مطبع منشی نو لکشور کی تمام ان کتابوں کے لئے جو صرف نو لکشور پریس ہی میں طبع ہوئی ہیں اور تمام فنون و علوم پر مشتمل ہیں، ذیل کے پتہ سے مکمل فہرست طلب فرمائیے۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:-

رباعیات انیس - دل دادگان حضرت انیس کے لئے وہ مجموعہ ہے جو پہلے نہیں طبع ہوا، اس کا مقدمہ سونے پر سہاگے کا کام کرنا قیمتی ہے۔
جواہر لال - انڈین یونین کے سب سے پہلے وزیر اعظم کے بچپن کے قصے نہایت دلچسپ اور مفید ہیں ہر شخص کو پڑھنا چاہئے۔ قیمت ۷۷۔
ٹرکی - کمال پاشا کے حالات زندگی کا آئینہ ہے، جس سے ایک قومی نظریہ سمجھ میں آتا ہے۔ قیمت ۷۷۔
ہندوستان کے قدیم شہر - ہندوستان کے قدیم شہروں کے مفصل حالات اس سے بہتر کہیں نہیں ملیں گے۔ قیمت ۷۷۔
لغات کشوری - بہت مشہور و معروف اور مقبول لغت ہے اس میں جس قدر اختصار وغیرہ کو مد نظر رکھا ہے وہ قابل دید و داد ہے۔ طلباء کے لئے بہت مفید ہے۔ قیمت مجلد ۷۷۔
فرنگ شفق - اردو کے بے شمار محاورات کا مجموعہ اور چار مستند استادوں کے کلام سے اکی اسناد پیش کی گئی ہیں، شعرا و زبان اردو کے شائقین کے واسطے ایک نایاب تحفہ ہے، مصنفہ شفق کان پوری۔ قیمت پانچ روپیہ (۷۷)۔
دیوان ناسخ - جدید طبع ہو جو نہایت اچھے طور پر طبع ہوا اور قیمت ۷۷۔
کلیات آتش - جدید طبع جو قدیم نسخوں سے مقابلہ کر کے نہایت اہتمام سے طبع کیا گیا ہے۔ قیمت ۷۷۔
کلیات میر - قیمت ۷۷۔

تاریخ حیدر آباد وکن - یہ کتاب ہر طرح جامع ہے اور مصنف مولانا نجم الغنی مرحوم نے اپنی معلومات کا ذخیرہ پیش کرنا قیمتی ہے۔
معرکہ چکبست و شرر - مولوی عبدالحلیم شرر اور منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کی تمام وکمال بحث مع منوی گلزار نیم اور غزلیات نسیم کے نہایت عمدہ کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ قیمت ۷۷۔
منوی میر حسن - یعنی بے نظیر اور بدر منیر کا نہایت مشہور و معروف قصہ۔ قیمت ۷۷۔
تاریخ اودھ - یہاں کے حکمران سادات بارہہ کے رنوخ خاندان بنگش، مرہٹوں کی شورش، نادر شاہ کے حملوں، روسیوں احمد شاہ ابدالی کی فتوحات وغیرہ کا عہد شجاع الدولہ سے واجدیشاہ بادشاہ آخری اودھ تک کے واقعات کا ایک مصفیٰ اور مجلی آئینہ ہے۔
از حکیم نجم الغنی - قیمت پانچ جلد کامل بارہ روپے (۷۷)۔
فسانہ آزاد - دنیائے ادب اردو میں کون ایسا شخص ہے جو پنڈت رتن ناتھ کے نام سے ناواقف ہے جسکے چوتھے مضامین سوئیاں بنکر پڑھنے والوں کے دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ ظرافت اُنکے گھر کی لوندی فصاحت و بلاغت ان کا خاص حصہ ہے، ہر فقرہ چلتا جادو اور ہر جملہ ایک تیز خنجر ہے جو کسی پر اپنا کام کے بغیر نہیں رہتا۔ چار جلدیں ہیں جن کی مجموعی قیمت ۷۷۔ جلد اول للہ۔ جلد دوم للہ۔ جلد سوم ۷۷۔ جلد چہارم ۷۷۔

راجہ رام کمار پریس بک ڈپو

مکتوبات نیاز تین حصوں میں	شہاب کی سرگزشت	جذبات بھاشا	فلاسفہ قدیم	شاعر کا انجام
اڈیش نگار کے تمام خطوط جو حضرت نیاز کا دو عظیم النظر	جذاب نیاز نے ایک کچھ	اس مجموعہ میں حضرت نیاز	جذاب نیاز کے غفوان شہاب	جذاب نگاری اسلاست بیان
افسانہ جو اردو زبان میں بالکل	تمیذ کے ساتھ بہترین ہندی	کے دو علمی مضامین شامل	لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی	رنگینی اور البیلے بن کے طالع سے
پہلی مرتبہ پیر نگاری کے ماحول	شاعری کے نونے پیش کر کے	ہیں :-	تمام انشہ بخش کیفیات اس کے	خزائن میں بالکل پہلی چیز ہیں
پر لکھا گیا ہے اس کی زبان	ایسی تشریح کی ہے کہ دل	چند گھنٹے فلاسفہ قدیم	ایک ایک جلد میں موجود ہیں یہ	جس کے سانسے خطوط غالب بھی پھیکے
و تفصیل اس کی نزاکت بیان	قیاب ہو جاتا ہے اردو میں	کی روحوں کے ساتھ	نشانے پلاٹ اور انشا کے	مطلوبہ تھے ہیں ان ڈیشنوں میں
اسکی بلند و مضمون اور اسکی	یہی سب پہلی کتاب اس	۲۔ مومنین کا مذہب	کلام سے اس قدر بلند چیز ہے کہ	پہلا ڈیشن کی غلطیوں کو دور
انشار عالیہ سحر حلال کے درجہ	موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں	نہایت مفید و دلچسپ	دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی	کر دیا گیا ہے اور پونڈ کاغذ
بیک پہونجی ہے۔	ہندی کلام کے بے مثل نمونے	کتاب ہے۔	تازہ ڈیشن نہایت صحیح و	پر طباعت ہوئی ہے قیمت حصہ اول
یہ ڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط	نظر آتے ہیں۔	قیمت ۱۔	خوشخط مسروق رنگین۔	دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے	قیمت بارہ آنے	ایک روپیہ	قیمت بارہ آنے	چلر روپیہ علاوہ محصول
علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول
فراسٹ الیہ	نقاب ٹھکانے کے بعد	مذاکرات نیاز	انتقادات (دو حصے)	مذہب
مولانا نیاز فتحپوری کے تین افسانوں	یعنی حضرت نیاز کی ڈائری	حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی	حضرت نیاز کا وہ محرکہ آکا مقام	مطالعہ سے ایک شخص باسانی
کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ	جو ادبیات تنقید عالیہ کا	مقالات و محمول جس تقسیم کئے	جس میں انھوں نے بتایا ہے	باتھ کی شناخت اور اس کی
ہمارے ملک کے ہادیان طریقت در	عجیب و غریب خیرہ ہے ایک بار	تھے ہیں پہلے حصہ میں اور مقالہ	کہ مذہب کی حقیقت کیا	لکھروں کو دیکھ کر اپنے
یا علماء کرام کی اندرونی زندگی	اس کو شروع کر دینا اخیر تک	ہیں جن میں خاص شعرا کے کلام	ہے اور یہ دنیا میں کیونکر	دوسرے شخص کے مستقبل
ہے اور ان کا وجود ہماری سماج	پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید	پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن	راکج ہوا۔	سیرت عروج و زوال امت
ماجتماعی حیات کیلئے کس بہ	اڈیشن ہے جس میں محنت اور	ظفر غالب، محقق نظر ہستی	اس کے مطالعہ کے بعد	حیات محنت و بیماری
سم قائل ہر زبان، پلاٹ و	نفاست کا غزو طباعت کا	جوش و مغر و غیر و غیرہ دوسرے حصہ	انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے	شہرت و نیکنامی پر صحیح
انشار کے لحاظ سے جو مرتبہ ان	حاصل ہوا کیا گیا ہے۔	میں عام ادبی و انتقادی مضامین	کہ مذہب کی پابندی کیا	پیشین گوئی کر سکتا ہے
افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے	قیمت :-	جس کا تعلق شعروادب کی تاریخ	میں رکھتی ہے۔	قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول	علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۶ء	جنوری ۱۹۴۶ء	جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۶ء
اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری فکر کے مضامین پر مشتمل ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول	اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری فکر کے مضامین پر مشتمل ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول	نگار ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا پتھر جس میں ۱۹۴۶ء سے لیکر ۱۹۴۶ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بعض ایسے اکابر شعرا و کاتبان کرد انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۶ء	جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۶ء	جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۶ء
اس سال کا نمبر "ماہنامہ نثر" جس میں ایک نثر فرانسیسی کی ایک شاعر کا ترجمہ ہے اور دو میں نقل کیا گیا ہے۔ ادب و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول	پاکستان نمبر نگار کا جو بی نمبر جس میں دنیا کے سائنس اسلام کی عظمت فتنہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو مطالعے کے لیے سامانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افشا نگاری کے دور میں ان کا ناموں نہ ہو سکا چنانچہ مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی قیمت تین روپیہ علاوہ محصول	اس سال کا نمبر "ماہنامہ نثر" جس میں ایک نثر فرانسیسی کی ایک شاعر کا ترجمہ ہے اور دو میں نقل کیا گیا ہے۔ ادب و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

نرخ نامہ اجرت اشتہار	نگار کی قیمت
ایک سال ایک صفحہ ۶۰ روپیہ آدھ صفحہ ۳۰ روپیہ پوٹھ کی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	ایک سال ایک صفحہ ۶۰ روپیہ آدھ صفحہ ۳۰ روپیہ پوٹھ کی صفحہ ۱۵۰ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے "منہجر"	جو کتب کے نگار بھیجنے والی ہوں اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل و شوار ہے
--	---